1-2-3
1962
خلافت لائبریری ربوہ
12/م

جنوری فروری مارچ 1962

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَمِمَّنْ خَلَقْنَا أُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ۝ (اعراف)

"بخرام کہ وقتِ تو نزدیک رسید و پائے محمدیاں بر منارِ بلند تر محکم افتاد"

روشنی اور رفعت کا نشان

المنار

تعلیم الاسلام کالج ربوہ

(علم و عمل)

سرپرست: صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب — نگران: چوہدری محمد شریف خالد

مدیر اعلیٰ: ارشد ترمذی — مدیر: رشید احمد جاوید

جنوری، فروری، مارچ ۱۹۶۲ء

جلد ۱۲ — شمارہ ۴

پرنٹر و پبلشر: جنید ہاشمی — مطبع: ضیاء الاسلام پریس — سرورق: نصرت آرٹ پریس

ربوہ

ترتیب

۱- اداریہ	ادارہ	۳
۲- الحکمۃ ضالۃ المؤمن	پروفیسر بشارت الرحمٰن	۹
۳- حدیث شریف	پروفیسر ملک محمد عبداللہ	۱۲
۴- امتحان سے پہلے!	لطف الرحمٰن محمود	۱۵
۵- اصلاحِ معاشرہ	اعجاز الحق قریشی	۱۹
۶- عبدالقادر یاد رہیگا؟	سمیع اللہ قریشی	۲۳
۷- الحبُّ لِلّٰہِ وَالبُغضُ لِلّٰہ	رشید احمد جاوید	۲۶
۸- آپ کے خطوط	قارئین المنار	۳۲
۹- مباحثہ	آفتاب احمد	۳۳
۱۰- ہمارے سالانہ مباحثے	ادارہ	۳۶
۱۱- شادی !!	ڈاکٹر سلطان محمود شاہد	۳۹
۱۲- علم و عمل	اعجاز الحق قریشی	۴۱
۱۳- علم و عمل	عبدالرشید ارشد	۴۵
۱۴- افسانہ	زرتشت منیر احمد	۴۹

تبرکات

۱- شانِ رسولِ اکرمؐ	از حضرت بانیٔ سلسلہ احمدیہ
۲- بے ثباتِ عالم	〃 〃 〃 〃

منظومات

۱- نالہ ہائے سحر	شیخ روشن دین تنویر	۵۵
۲- سخن با آفتاب	ابوالحسن قدسی	۵۶

غزلیات

۱-	ارشد ترمذی	۵۷
۲-	راجہ نذیر احمد ظفر	۵۸
۳-	مظہر قیوم ناز	۵۸
۴-	اقبال محمد خاں	۵۹
۵-	سعید کاشر	۵۹
۶-	قاضی ظہور الدین اکمل	۶۰
۷-	ارشد ترمذی	۶۱
۸-	لطف الرحمٰن محمود	۶۲
۹-	پروفیسر محمد شریف خالد	۶۳
۱۰-	راشد چوہدری	۶۳
۱۱-	پروفیسر نصیر احمد خاں	۶۳

اداریہ

"ہمارا طالب علم" اور اُس کے فرائض

تعلیم الاسلام کالج کی بنیاد دو اُمور کے پیشِ نظر رکھی گئی تھی۔ اوّل یہ کہ مسلمان طلبہ اسلامی ماحول میں جدید علوم حاصل کر سکیں۔ یا یُوں کہیئے کہ تعلیم الاسلام کالج کے قیام کا پہلا مقصد مسلمان طلبہ کے اندر تعلیم کی حقیقی اشاعت اور اسکی صحیح اور صحتمند ترویج تھا۔

دُوسرا مقصد اس "ادارہ" کے قیام کا یہ تھا کہ "علومِ جدیدہ" کی طرف سے مذہب پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں، اُن کا بطلان انھیں علوم کی روشنی میں ثابت کیا جائے۔ تا دُنیا اِس بات کو تسلیم کرلے کہ فلسفہ اور دیگر سائنسی علوم کی طرف سے اعتراضات کے گھٹا ٹوپ بادل جو مذہب کے رُخِ تاباں پر چھائے ہُوئے ہیں اسلام ان کے ردّ کی پُوری پُوری طاقت رکھتا ہے۔ چُونکہ ان حملوں کی نوعیت علمی ہے۔ اِسلئے "ہمارا طالب علم" متذکرہ بالا مقاصد کو اُس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اوّلاً "علوم جدیدہ" کی گہنہ اور تہہ تک نہ پہنچے۔ اور ثانیاً اپنے مذہب سے پُوری پُوری واقفیت حاصل نہ کرے۔" ہمارے طالب علم" کو ناقص علم سے ہوشیار رہنا چاہیئے خواہ وہ کسی بھی چیز کا ہو کیونکہ وہ ہرگز ہرگز خطرہ سے خالی نہیں۔ تعلیم الاسلام کالج کا طالب علم دنیوی اور دینی دونوں علوم کا شہسوار ہونا چاہیئے۔

ہمارے طالب علم کو کسی "علمِ جدید" کا مطالعہ کرتے وقت تین چیزوں کو بالخصوص مدِ نظر رکھنا چاہیئے:-

اوّل یہ کہ اس کا ایک قادرِ مطلق اور علیم و حکیم خدا ہے اور اُس کا قول اور فعل برحق ہے۔

دوئم یہ کہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے برحق نبی اور رسُول ہیں۔

سوئم یہ کہ جو پیغام حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام خدا کی طرف سے لائے وہ ایک ایسی محکم اور یقینی کتاب پر مشتمل ہے، جو کہ لَا رَیْبَ فِیْہِ اور فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ کی مصداق ہے۔ اور تمام عالم کے لئے آخری اور مکمّل ضابطۂ حیات کی حیثیت رکھتی ہے۔

اِن تین امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے اندازہ لگائیے کہ تعلیم الاسلام کالج میں پڑھنا آپ سے کیا مطالبہ کرتا ہے۔ ہمارے کالج کی اساس مذہب پر ہے اور مذہب کا مرکزی نقطہ وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان اور اسکی وحدانیت کا اقرار ہے۔ اور وجودِ باری تعالیٰ پر ایمان اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اس کے فرستادوں اور برگزیدہ بندوں کی تکریم قائم کریں۔ اور یہ تکریم اِس طرح قائم ہو سکتی ہے کہ وُہ جو لائحہ عمل ہمارے سامنے پیش کریں ہم اُس کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالیں۔ اور اُس ضابطۂ حیات یا لائحہ عمل پر جو اندرونی یا

بیرونی اعتراضات ہوں، اُن کا ردّ کریں۔ لیکن اس کیلئے ضروری ہے کہ ہمیں ان اعتراضات کے اصل اور منبع کا علم ہو۔ ہم اُن علوم کا گہرا اور سیر حاصل مطالعہ کریں جو ان اعتراضات کے محرک ہیں۔ جب ہم ان دونوں پہلوؤں پر عبور حاصل کرلیں گے، تو ہمارا تعلیم الاسلام کالج میں پڑھنے کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اپنے نقطۂ نظر کو واضح کرنے کیلئے ہم کسی علم جدید کو بطور مثال لے لیتے ہیں۔ فرض کیجئے یہ اقتصادیات (Economics) ہے۔ ہمارا طالب علم جب اقتصادیات کا مطالعہ کرے تو اس کے دو فرائض ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ اسلام کے پیش کردہ اقتصادی اصولوں اور معاشی نظریات کا جائزہ لے اور اُن کا بغور مطالعہ کرے۔ اگر وہ محولہ بالا تین بنیادی اُمور کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے یہ اقدام کرے، تو اسلامی معاشی نظام کا ایک صحیح ڈھانچہ مرتب کرلے گا۔ اس کا دُوسرا فرض یہ ہوگا کہ وہ متعلقہ علم جدید (اقتصادیات) کے اصولوں اور نظریات کو لے۔ اگر وہ اصول یا نظریات اسلامی معاشی نظریات سے متعارب نہیں تو فبہا۔ لیکن اگر بعض اصول ہمارے مسلّمہ نظریات سے متعارب ہوں، تو پھر ہمارا ردِّ عمل یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم عاجزی اور شکست کا اظہار کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیں بلکہ تعلیم الاسلام کالج کا طالب علم ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام یہ ہو کہ ہم ان نظریات کو ناقدانہ غور و فکر سے پرکھیں اور دیکھیں کہ کہاں خرابی واقع ہے اور اس وقت تک حق ادا نہیں ہوگا، جب تک کہ ہم متعارب نظریات کو باطل اور غلط ثابت نہ کردیں۔ ہماری تحقیق ایسے رنگ میں ہو۔ کہ نہ صرف عقلی اور مذہبی طور پر اسلامی نظریات کی برتری ثابت کر دکھائیں بلکہ متعلقہ علم بھی اُسکی برتری کو تسلیم کرلے۔

اس وقت تقریباً ہر علم جدید میں کوئی نہ کوئی ایسا نظریہ موجود ہے، جو یا تو بظاہر کسی اسلامی نظریہ سے متعارب ہے یعنی یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وُہ متعارب ہے۔ لیکن ابھی تک تحقیق نہیں کی گئی یا اسکی براہِ راست کسی اسلامی نظریہ سے ٹکر ہے۔ مثلاً اقتصادیات میں سُود اور خاندانی منصوبہ بندی کا نظریہ ہے۔ ہمارے طالب علم کا فرض ہے کہ اوّل الذکر صورت میں اختلافات کو مناسب تحقیق و تدقیق کے بعد رفع کرکے اسلام کے نُورانی چہرہ کو مزعومہ الزام سے پاک کرے۔ اور مؤخر الذکر صورت میں اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے کام لے کر یہ ثابت کردے کہ انسان کی حقیقی فلاح اور بہبود اسی میں ہو کہ وُہ اسلامی نظریات کو اپنائے، یا یہ کہ حق وُہی ہے جو اسلام نے بیان کیا ہے۔ اور اپنے دلائل کی عمارت کو ٹھوس حقائق کی بنیادوں پر استوار کرے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ "ہمارا طالب علم" اس ذمہ داری کو اُٹھانے کے لئے تیار ہو جائے، اور کیوں نہیں اُسے یہ ذمہ داری اُٹھانی چاہیئے۔ ورنہ تعلیم الاسلام کالج میں اُس کا پڑھنا بے فائدہ ہو۔ وہ اس درسگاہ کا مایۂ ناز فرزند صرف اسی صُورت میں کہلا سکتا ہے کہ وُہ اسلامی تعلیم کی برتری کو ثابت کرے اور اسلام کے دفاع میں اپنی علمی صلاحیتوں کو کام میں لائے۔

اگرچہ یہ سچ ہے کہ اسلام کو اپنی صداقت ثابت کرنے کیلئے سائنس یا فلسفہ یا حساب یا دیگر علوم جدیدہ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، وہ ان سب سے بالا ہے۔ لیکن دُنیا میں کچھ لوگ اسلام کے متعلق بعض وہموں میں مبتلا ہیں وُہ ان علوم کے رُعب سے اسلام کی تائید میں آواز نہیں اُٹھا

سکتے۔ یہ وہ ضرورت تھی جس کیلئے تعلیم الاسلام کالج کا اجراء کیا گیا۔ تا ایسی بھٹکی ہوئی رُوحوں کی ہدایت اور راہ نمائی کا انتظام کیا جائے۔ پس اِس ادارہ کے طالبعلموں (خواہ وہ فارغ التحصیل ہوں یا ہنوز تعلیم مکمل نہ کر پائے ہوں) کا فرض ہے کہ وہ انسانوں کے اِس طبقہ تک اسلام کی سچائی کو پہنچائیں اور اسکی حقانیت کو ثابت کردیں اور انہیں بتائیں کہ علومِ جدیدہ کی نئی تحقیقات بھی اسلام کی مؤیّد ہیں۔

ہمارے کالج کے حقیقی طالب علم کا یہ بھی فرض ہے کہ وُہ اپنے ساتھیوں اور رفیقوں کو ہمیشہ یہ بتاتا رہے کہ یہاں کوئی ایسا طریق برداشت نہیں کیا جاسکتا جو دین کے خلاف ہو اور رُوحانی اقدار اور مذہبی روایات کے منافی ہو۔ بے دینی اور خلافِ مذہب حرکات کو دیکھ کر ہمارے طالب علم کو ہرگز خاموش نہیں رہنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بے حمیتی اور بے غیرتی ہوگی۔ انھیں چاہیئے کہ وہ ایسی حرکات کے ارتکاب کرنے والوں کو بتادیں کہ یہ فضا اُن کے لئے سازگار نہیں۔ ہمارے کالج کے پڑھنے اور پڑھانے والوں کو اِس کالج کے موسس حضرت امام جماعت احمدیہ (أَطَالَ اللّٰہُ بَقَاءَہٗ) کے ان ڈرا دینے والے الفاظ کو ہمیشہ ذہن نشین رکھنا چاہیئے کہ "اگر کسی وقت یہ محسوس ہو کہ یہ کالج بجائے دین کی تائید کرنے کے بے دینی کا ایک ذریعہ ثابت ہو رہا ہے تو ہم ہزار گنا بہ زیادہ بہتر سمجھیں گے کہ اِس کالج کو بند کردیں"

اے محمد رسُول اللہ ؐ کے باغ کے حسین پھُولو! جو اُس بیج کی پیداوار ہو جو تعلیم الاسلام کالج کے نام پر بویا گیا۔ تم اپنی خوشبو سے تمام عالم کو مہکا دو۔ تم دُنیا سے دہریت کی تمام شاخوں کو کاٹ ڈالو۔ اپنے اخلاق، اپنی عادات، اپنے خیالات اور اپنے افکار سے دُنیا کیلئے ایک رحمت کا نمونہ بن جاؤ۔ اپنی علمی اور فکری قوتوں اور پُر خلوص اور پیہم عمل سے کفر اور بے دینی کو دُنیا سے مٹا دو۔ دُنیا میں بڑھتی ہُوئی بے دینی کے چیلنج کو قبول کرو۔ اور وقت کے اِس عظیم اور اہم تقاضہ کو پُورا کرو۔ تا جب روزِ محشر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور حاضر ہو، تو اپنی گردنیں اُونچی کرسکو اور خدا اور اُس کے رسول ؐ کی خوشنودی کے مورد ٹھہرو۔

رمضان کی آمد آمد:

رمضانُ المبارک شروع ہونے والا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین اِس مبارک مہینہ کے استقبال کیلیے جوش و خروش سے تیاریاں کر رہے ہوں گے۔ رمضان المبارک کا مہینہ بے شمار برکات کا حامل ہے۔ ہم سب کو ان برکات کے حصول کی کوشش کرنی چاہیئے۔ ہمارے ان الفاظ کو کوئی بے معنی جملہ خیال نہ کرے بلکہ ہم پُورے یقین سے کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پُورے خلوص اور صحت نیّت سے رمضان المبارک کے روزوں کا اہتمام کرے تو ایک ماہ کے بعد لازماً وُہ اپنے اندر ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کریگا اور اِس بابرکت مہینہ کے پاکیزہ اثرات کو اپنے اُوپر محیط پائے گا۔ روزے کا اصل مقصد تو جیسا کہ خُدا تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں فرمایا ہے تقویٰ کا حصول ہے۔ پس کیا ہی خوش قسمت ہے وُہ شخص جو اس ماہ میں تقویٰ کے حصول میں کامیاب ہو جائے۔ یہ وُہ چشمہ ہے کہ ہر ایک نیکی اسی سے پھُوٹتی ہے۔ اور یہ وُہ گوہر ہے جس کے نتیجہ میں انسان کے اندر ایسی بے پناہ قوّت مدافعت پیدا ہو جاتی

ہے کہ وُہ ہر کبیرہ اور صغیر گناہ سے بچ جاتا ہے۔

وَمَا تَوْفِیْقُنَا اِلَّا بِاللّٰہِ

مُحاسبۂ نفس:

ٹھوکریں اور ناکامیاں، کامیابیوں اور کامرانیوں کی پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ اِنسان دِن بھر میں کئی اعمال بجالاتا ہے اور اُنکو بُھول جاتا ہے۔ مگر عقلمند انسان وُہ ہے جو اپنے اعمال کو جن کو وُہ بجالائے پیشِ نظر رکھے۔ اِس لئے ضروری ہے۔ کہ وُہ اکثر اوقات اپنے نفس کا محاسبہ کرتا رہے۔ انسان گذشتہ واقعات سے سبق حاصل کرتا ہے۔ محاسبۂ نفس سے اُس کے اعمال کی قباحتیں اور خُوبیاں اُسپر واضح ہوجاتی ہیں۔ ذی شعور انسان کو چاہیئے کہ وُہ اپنی قباحتوں سے سبق حاصل کرلے اور خوبیوں کو مشعلِ راہ بنائے۔ ہم قارئین سے توقع رکھتے ہیں کہ وُہ اِس زرّیں اُصول کو اپنائیں گے اور محاسبۂ نفس کو اپنی عادت بناکر اپنے اخلاق اور عادات میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کریں گے۔

فیل ہونے والوں کی بڑھتی ہُوئی تعداد:

تعلیمی حلقوں کا یہ اضطراب بڑھتا جارہا ہے کہ سال بہ سال فیل ہونے والوں کی تعداد میں یہ معتدبہ اضافہ کیوں؟ اخبارات کا مطالعہ کرنے والوں اور بالخصوص ان کے ادارتی کالموں سے دِلچسپی رکھنے والوں نے یہ دیکھا ہوگا کہ عموماً اِس مسئلہ کی تین وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔

(۱) اساتذہ محنت سے نہیں پڑھاتے۔

(۲) کتابیں اچھے طریق سے نہیں لکھی گئیں۔

(۳) منظوری کے بعد کتابیں کئی کئی ماہ طالب علم کو دستیاب نہیں ہوتیں۔

ہمارے خیال میں اگرچہ ان تین وجوہات کا بھی اس ضمن میں تھوڑا بہت تعلق ہے مگر سب سے بڑی وجہ اور ہمارے تجربہ کی بات یہ ہے کہ جدید زمانہ کی لغتوں نے ہمارے نوجوانوں کے ذہن ہی ایسے نہیں چھوڑے کہ وُہ اچھے طالب علم بن سکیں۔ آوارگی اور مخرب اخلاق باتوں کی طرف ان کا رجحان بدستور بڑھ رہا ہے۔ ان کی توجہ کا مرکز پڑھائی نہیں بلکہ سینما ہاؤسوں کے اشتہار ہیں۔ وہ ہر دم کسی شو کو دیکھنے کیلئے بے تاب نظر آئیں گے۔ وُہ مزے لے لے کر ایسی باتوں کو سُنیں گے کہ فلاں فلم میں کس کی "ایکٹنگ" اچھی تھی؟ گانوں کا معیار کیسا تھا؟ "میوزک" کیسا تھا؟ رقص کس کا کامیاب تھا؟ یا پھر وہ کسی حجام یا پان والے کی دُکان کی زینت بنے ہُوئے ہوں گے تا اگر سینما ہاؤس میں گانوں کی کچھ کسر رہ گئی تھی تو یہاں پُوری ہو جائے۔ ریڈیو اور اُس کے گانوں میں اُن کی جان ہے۔ قہوہ خانے ایسے آوارہ لڑکوں سے اَٹے پڑے ہوتے ہیں۔ نامعلوم وُہ اپنے وقت عزیز کے کتنے گھنٹے محض گپّوں اور فضولیات میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اعداد و شمار جمع کئے جائیں تو آج کا طالب علم جس قدر اخلاق سوز حرکات اور افعال شنیعہ کا مُرتکب ہوتا ہے، ربع صدی پہلے کا طالب علم اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔

ان حقائق سے یہ امر واضح ہے کہ اصل خامی ہمارے تعلیمی نظام یا اساتذہ میں نہیں بلکہ خود "طالب علم" میں ہے کیا ہی اچھا ہو اگر محکمۂ تعلیم کے اربابِ حل و عقد طلبہ کے

اِس بڑھتے ہوئے ذہنی انتشار کا کوئی حل سوچیں۔ اگر ہمارے ماہرینِ تعلیم یورپین سکولوں کے نصابِ تعلیم کو جاری کرنے کی سفارش کر سکتے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ وہ ہمارے لئے ایک یورپی طالب علم کی فضا مہیا کرنے کی سفارش نہیں کر سکتے۔ کیا یہ اچھی بات مومن کی گمشدہ متاع نہیں؟ یورپین لوگوں نے تعلیمی اداروں کے متعلق کئی قسم کے قواعد بنائے ہوئے ہیں اور طلبہ پر بعض خاص پابندیاں عائد کی ہوئی ہیں۔ ہمارے ملک میں بھی طلبہ پر ایسی پابندیاں لگنی چاہئیں۔ اگر حکومت اِس طرف توجہ دے تو ہمیں اُمید ہے کہ طلبہ اخلاقی لحاظ سے کافی بلند معیار حاصل کر لیں گے۔ اور اِس طرح ہمارا یہ نیا پیدا شدہ مسئلہ آسانی سے حل ہو جائے گا۔

اِنعامی مُقابلہ :

مقابلہ کی روح انسان میں ترقی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ طلبہ میں مضمون نویسی سے شغف پیدا کرنے کیلئے مضمون نویسی کا ایک انعامی مقابلہ کروایا گیا تھا۔ اس کا موضوع اگرچہ عام فہم اور آسان تھا، تاہم بہت اہم تھا۔ شریکِ مقابلہ مضامین کا معیار تسلی بخش تھا پھر بھی ہم مضمون نگار حضرات کی خدمت میں عرض کرینگے

نِرخ بالا کُن کہ اَرزانی ہنوز

اِس مقابلہ میں اعجاز الحق قریشی کا مضمون اوّل رہا۔ عبد الرشید ارشد اور اقبال احمد نجم کے مضمون علی الترتیب دوم اور سوم رہے۔ اوّل الذکر دو مضامین شریکِ اشاعت ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اِس مقابلہ میں شریک تمام مضامین باری باری قارئین تک پہنچائیں۔

کالج کی سرگرمیاں :

سابقہ اشاعت سے لے کر اِس وقت تک کالج مختلف قسم کی سرگرمیوں کا گہوارہ بنا رہا۔ کالج میں نہ صرف علمی و ادبی مجالس کا انعقاد ہُوا بلکہ ورزشی اور جسمانی مقابلے بھی منعقد ہوتے رہے۔

ذیل میں ان کارگذاریوں کی تفصیل دی جا رہی ہے:۔

"علمی و ادبی مجالس": ۔ کالج یونین نے چار آل ربوہ انعامی مباحثات منعقد کئے۔ اور مولانا نذیر احمد صاحب مبشر نے "افریقہ میں اسلام" کے موضوع پر تقریر کی۔

مجلسِ ارشاد : ۔ سید زین العابدین ولی اللہ شاہ صاحب نے "قرآن مجید کے اعجازِ بلیغ" اور مولانا جلال الدین صاحب شمس نے "مذہبی گفتگو کے آداب ازروئے قرآن" کے موضوعات پر تقاریر کیں۔

"بزمِ فارسی" کے زیر اہتمام پروفیسر شکور احسن یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور نے "فارسی زبان میں ارتقائے عمل" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

"بزمِ اردو" کے زیر اہتمام ڈاکٹر عبادت بریلوی نے "تنقید نگار اور اُسکے فرائض" کے موضوع پر اور ڈاکٹر عبد البصیر پال صدر شعبۂ طبعیات پنجاب یونیورسٹی نے "آواز" کے موضوعات پر تقاریر کیں۔ حال ہی میں ایک مشاعرہ بھی ترتیب دیا گیا جس میں ملک کے متعدد مشہور شاعروں نے حصہ لیا۔

"مجلسِ اقتصادیات" کے زیر اہتمام ملک

سیف الرحمان صاحب پروفیسر جامعہ احمدیہ نے "کیا انشورنس جُوا ہے؟" کے موضوع پر ایک پُر مغز مقالہ پڑھا۔

ورزشی و جسمانی سرگرمیاں:-

○ باسکٹ بال کا ایک آل ربوہ ٹورنامنٹ ہوا۔ علاوہ ازیں حال ہی میں چوتھا آل پاکستان باسکٹ بال ٹورنامنٹ منعقد ہوا جسمیں ملک کی نامور ٹیمیں شریک ہوئیں۔

○ والی بال کا انٹر کلاس ٹورنامنٹ منعقد ہوا۔ اس ٹورنامنٹ کی قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اس میں کالج سٹاف کی ٹیم صاحبزادہ مرزا ناصر احمد صاحب پرنسپل کی قیادت میں شریک ہوئی۔ سٹاف ممبران نے بڑے اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ سٹاف ٹیم کی اس ٹورنامنٹ میں شمولیت والی بال کی غیر معمولی مقبولیت کی دلیل ہے۔

○ جنوری کے آخری عشرہ میں کالج کی سالانہ کھیلیں بڑے اہتمام سے منعقد ہوئیں۔ محترم پرنسپل صاحب نے اس کا افتتاح کیا اور سارا وقت کھیل کے میدان میں تشریف فرما رہے۔ کھیلوں کے یہ مقابلے بڑے نظم و ضبط کے ماتحت عمل میں آئے۔ طلبہ نے اسمیں غیر معمولی دلچسپی لی اور بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

قابلِ ستائش:-

کالج کے طلبہ نہ صرف کالج کے علمی و ورزشی مقابلوں میں شریک ہوتے رہے۔ بلکہ دوسرے کالجوں کے مقابلوں میں بھی کالج کی نمائندگی کرتے رہے۔ اور اپنی اعلیٰ قابلیت کا ثبوت دیا۔

○ اُردو کالج کراچی کی مجلس سیرت کے زیرِ اہتمام آل پاکستان انٹر کالجیئیٹ تحریری مقابلہ میں چوہدری رشید احمد جاوید سال دوم (بی اے آنرز) نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ آپ نے یہ اعزاز "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت رحمتِ عالم" کے موضوع پر مقالہ لکھ کر حاصل کیا۔

○ گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد کے آل پاکستان انٹر کالجیئیٹ انگریزی مباحثہ میں سید مشہود احمد بی اے سال اوّل دوم رہے۔

○ گورنمنٹ کالج منٹگمری کے آل پاکستان انٹر کالجیئیٹ انگریزی مباحثہ کی ٹرافی ہمارے کالج نے جیتی۔ اس مباحثہ میں کالج کی نمائندگی نور محمد جانڈیہ اور سید مشہود احمد نے کی۔

○ گورنمنٹ کالج سرگودھا کے آل پاکستان انٹر کالجیئیٹ انگریزی مباحثہ میں نور محمد جانڈیہ (بی اے سال اوّل) نے تیسرا انعام حاصل کیا۔

○ گورنمنٹ کالج جہلم کے آل پاکستان انٹر کالجیئیٹ اُردو مباحثہ میں ہمارے کالج نے ایک دفعہ پھر ٹرافی جیت لی۔ گذشتہ سال بھی یہ ٹرافی ہم نے ہی جیتی تھی۔ اس مباحثہ میں جاوید احمد (گیارھویں کلاس) اور عطاء المجیب راشد بی اے (سال اوّل) نے بالترتیب پہلی اور تیسری پوزیشن حاصل کی۔

○ گورنمنٹ کالج جوہرآباد کے ایک ایسے ہی انگریزی مباحثہ میں ہمارے کالج نے ٹرافی جیتی۔ اس مباحثہ میں ہمارے کالج کی نمائندگی فضل احمد بی اے (سال دوم) اور خالد ملک بی۔ اے (سال اوّل) نے کی۔ فضل احمد نے دوسرا اور خالد ملک نے تیسرا انعام حاصل کیا۔ اس طرح مجموعی طور پر ٹرافی ہمارے کالج کے حصے میں آئی۔

ادارۂ المنار ان تمام کامیابیوں پر انعام حاصل کرنیوالے طلبہ اور محترم پرنسپل صاحب کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتا ہے اور دُعا گو ہے کہ یہ اعزازات پیش از پیش کامیابیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوں آمین۔

پروفیسر بشارت الرحمٰن ایم۔اے

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ

قطار بندی اور اسکی اہمیت

گذشتہ دنوں ایک کالج میں بین الکلیاتی اُردو مباحثہ میں مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ "ہماری قومی ترقی کیلئے تقلید مغرب ناگزیر ہے"

اِس مسئلہ کے حامیوں نے مغربی تہذیب و تمدّن میں سے بہت سی ایسی مثالیں پیش کی ہونگی جنہیں اپنے ہاں ترویج دینا یقیناً ہماری قومی ترقی کا موجب ہوسکتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ حکمت اور دانائی پر مشتمل اُصول جو ہماری دُنیوی یا اُخروی فلاح سے تعلّق رکھتا ہے۔ دراصل اسلام میں موجود ہے۔ اگر وہ چیز اس وقت ہمیں اہلِ مغرب کے ہاں نظر آتی ہے تو ہمیں یقین رکھنا چاہیئے کہ وہ ہمارا اپنا ہی گم شدہ متاع ہے جسے اغیار نے اپنالیا اور فائدہ اُٹھایا۔ جسے بدقسمتی سے ہم نے فراموش کر دیا اور قعرِ مذلّت میں جا گرے۔

آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں :-

اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ
اَخَذَھَا مِنْ حَیْثُ وَجَدَھَا۔

کہ دانائی اور عقلمندی پر مشتمل ہر امر مومن کی اپنی ہی گم شدہ متاع ہے۔ جہاں سے بھی اُسے ملے۔ اُسے اپنی گمشدہ چیز سمجھکر حاصل کرلینا چاہیئے۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ہمیں احساس ہو کہ یہ امر واقعی ہمارے پاس بھی موجود تھا جسے ہم گم کر چکے تھے۔ اہلِ مغرب کے ہاں ہمیں اگر ایسی باتیں ملیں جو مفید ہوں تو اُنہیں ضرور اپنانا چاہیئے۔ مگر تقلید مغرب کی ذہنیّت سے نہیں بلکہ اسلئے کہ وہ چیز دراصل اسلام کی تعلیم یا اسکی رُوح کے تحت آتی تھی جسے ہم بھول چکے تھے۔ اس طرح سے ہمیں اپنے مذہب کی گہرائیوں میں جانے اور وہاں سے انمول موتی نکالنے کی بھی توفیق ملیگی۔ اور ہمارے اندر احساسِ کمتری بھی پیدا نہ ہوگا۔

انہی اُمور میں سے ایک چیز قطار بندی ہے۔ اگر آپ انگلستان یا امریکہ جائیں تو ہر جگہ آپ دیکھیں گے۔ کہ جہاں ذرا بھی ہجوم ہو جاتا ہے، لوگ فوراً ایک "کیو" (Queue) یا قطار کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور باری باری اپنا کام کرتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً اگر ریلوے سٹیشن پر لوگ ٹکٹ خرید رہے ہیں تو ایک قطار کی صُورت میں آگے بڑھتے جائیں گے اور باری باری آرام سے ٹکٹ خریدتے چلے جائیں گے۔ اگر بازار سے راشن خریدا جارہا ہے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ ایک قطار لگی ہوئی ہے۔ مرد، عورتیں اور بچّے آرام سے اپنی باری پر آگے آکر راشن حاصل کرتے چلے جاتے ہیں۔ اِس کے برعکس مسلمان کہلانیوالے،

اپنے عوام کا حال دیکھیں کہ جہاں ذرا بھی ہجوم ہُوا۔ فوراً دھکّم دھکّا۔ باہم تُو تُو مَیں مَیں اور نفسا نفسی شروع ہو جاتی ہے۔ ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ سب سے پہلے مَیں ہی فلاں چیز حاصل کر لُوں۔ خواہ وہ سب سے آخر میں ہی کیوں نہ آیا ہو۔ اگر معزّزین اور بڑے طبقے کے آدمی وہاں پہنچتے ہیں۔ تو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے اُن کی طرف توجّہ کی جائے۔ ہر جگہ ہمیں یہی حال نظر آتا ہے۔ اگر گوشت کی دوکان ہے۔ تو وہاں بھی چھوٹا بڑا گلا پھاڑ پھاڑ کر چلّا رہا ہے۔ دیکھنا بھئی ایک پاؤ گوشت پہلے مجھے دیدو۔ دُوسرا آتا ہے اور کہتا ہے دیکھو بھئی مَیں ایک گھنٹہ سے کھڑا ہوں۔ اب جلدی کرو۔ الغرض ایسا طوفان بدتمیزی بپا ہوتا ہے کہ ایک حسّاس انسان کے لئے ایسی جگہ پر کھڑا ہونا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر اُس حالت میں یہ کہا جائے کہ آؤ بھئی قطار بنالیں اور باری باری اپنی چیز لیتے جائیں تو لوگ حیران ہو کر دیکھنے لگتے ہیں کہ کیسی گھٹیا بات کہی جا رہی ہے۔ نمبروار قسم کے لوگ تو اپنی سخت ہتک محسوس کرتے ہیں کہ یا للعجب ہمیں ہاں ہمیں کہا جا رہا ہے کہ ہم قطار میں کھڑے ہوں۔ بھلا اس سے بڑھ کر بے تمیزی اور بے شرمی کیا ہو سکتی ہے کہ "ہم" قطار میں کھڑے ہوں؟

اب ناظرین ذرا غور کریں کہ کیا ایسے گروہ میں باہمی محبّت و یگانگی و اُخوّت کے جذبات ترقی کریں گے یا نفرت کے؟ انکے قلوب صاف ہوں گے یا باہمی نفرت و حقارت کے گند سے پُر ہوتے جائیں گے؟ اگر ایک انگریز، جرمن یا امریکن یہ نظّارہ دیکھے تو وہ مُسلمانوں کے متعلّق کیا اندازہ لگائیگا؟ بس یہی کہ ان کے مذہب نے ابھی اِن لوگوں کو حیوانیت کے درجہ سے بھی اُونچا نہیں کیا۔ مذہب نے ابھی اِن کو انسانیت ہی نہیں سکھلائی اللہ تعالیٰ تک پہنچانا تو دُور کی ہے۔ آہ! اس کو کیا خبر کہ ان لوگوں نے خود ہی مذہب کی حقیقت کو فراموش کر دیا ہے۔ وُہ نمازوں میں ظاہری اُٹھنے بیٹھنے کو ہی دین کی معراج سمجھ بیٹھے ہیں۔ بلکہ اس ظاہری نماز کو انہوں نے اپنی تمام تر نالائقیوں کا کفارہ سمجھ لیا ہے۔ یہ اس امر کو بھی بھول چکے ہیں کہ نماز اور روزہ و دیگر عبادات تو کسی منزل پر پہنچنے کی سواریاں یا ذرائع ہیں۔ خود منزلِ مقصود نہیں ہیں۔ عبادات کا مُدّعا اور مقصود تو نفس کی پاکیزگی اور حسنِ باطنی اور تخلّق باخلاقِ اللہ ہے۔ ہمیں ہر وقت یہ ٹوہ لگاتے رہنا چاہیئے کہ ہم کس حد تک اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے رنگین ہوئے ہیں۔ اپنی عبادات کی قبولیت یا عدم قبولیّت کا اِسی امر سے اندازہ کرنا چاہیئے۔ لیکن اِس کے برعکس یہ حال ہے کہ اکثر لوگ ظاہراً نماز پڑھتے ہیں۔ لوگ یہی دیکھتے ہیں کہ فلاں شخص نماز پڑھ رہا ہے۔ حالانکہ خُدا تعالیٰ کی نظروں میں وہ شخص نماز نہیں پڑھ رہا ہوتا۔ ایک دفعہ ایک بدّو نے مسجد نبوی میں آکر نماز ادا کی۔ تو آں حضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا۔

یَا اَعْرَابِیُّ۔ قُمْ فَصَلِّ فَاِنَّکَ لَمْ تُصَلِّ۔

کہ اے بدّو۔ اُٹھ اور پھر نماز پڑھ کیونکہ تُو نے نماز نہیں پڑھی۔

پس جو لوگ نماز کی حقیقت سے غافل رہتے ہیں اُن کی نماز محض دِکھلاوے کی نماز ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

وَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ یُرَآءُوْنَ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

تباہی اور ہلاکت ہے ایسے نمازیوں کیلئے جو اپنی نماز کی حقیقت سے غافل رہتے ہیں اور صرف دِکھلاوے کی ظاہری

نماز پڑھتے ہیں۔ ان کا مقصود باطنی صفائی۔ تعلّق باللہ اور باہمی اخوت و محبّت کے جذبات کو ترقی دینا نہیں ہوتا۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ ایسے ظاہری نمازی، چھوٹی چھوٹی استعمال کی چیزیں ایک دُوسرے کو عاریتاً دینا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اگر یہ لوگ حقیقی نماز پڑھتے تو کیا ان کے قلب کی یہ حالت ہوتی کہ ادنیٰ ادنیٰ چیزوں کو بھی ایک دُوسرے سے روکتے۔

اِسی طرح اگر ہمارے عوام جو آپس میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر دھکّم دھکّا کرتے ہیں۔ کیا اُن کو سچّا نمازی کہا جا سکتا ہے؟ اگر وہ سچّی نماز پڑھتے تو اُن کے قلوب کی ایسی ہی گندی حالت ہوتی کہ ایک معمولی چیز کے حصُول کیلئے اور پھر پانچ منٹ اُسے پہلے حاصل کرنے کے لئے وُہ اپنے بھائیوں کو دھکّے دیتے اور اُن کا حق دباتے؟

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ہے۔ کہ نمازوں میں اپنی صفیں درست اور سیدھی کیا کرو۔ ورنہ تمہارے دِل ٹیڑھے ہو جائیں گے۔ ذرا غور تو کرو۔ کہ اگر نماز میں جہاں انسان اللہ تعالیٰ کے دھیان میں کھڑا ہوتا ہے اگر صف ٹیڑھی ہونے سے دِل ٹیڑھے ہو جاتے ہیں۔ تو ریلوے سٹیشن۔ بس سٹینڈ یا راشن کی دوکان پر جانوروں کی طرح ہنگامہ کرنے سے کیا دِلوں میں کجی پیدا نہ ہوگی؟

کیا اِس طرح ہنگامہ آرائی کرنا انسانیت کا مظاہرہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ انسان کا لفظ اُنس سے نکلا ہے۔ اُنسان کے معنی ہیں دو محبّتیں۔ ایک خُدا کی اور ایک بنی نوع کی۔ پس انسان وہی ہے جو ایک طرف خُدا سے محبّت کرے اور اُس کی رضاء کی تلاش کرے تو دُوسری طرف اپنے بنی نوع سے ہمدردی اور الفت بڑھائے۔

جو لوگ قطار نہیں بناتے اور اپنے بھائیوں سے ایل پیل کرتے ہیں، تُو تُو مَیں مَیں کرتے ہیں اور وہ بھی صرف ایک ادنیٰ سی شئی کی خاطر، تو کیا اُن کے متعلّق کہا جا سکتا ہے۔ کہ یہ لوگ بھی خدا تعالےٰ سے محبّت کرتے ہیں اور اپنے بھائیوں سے بھی؟ پس بلاشبہ ایسی ہنگامہ آرائی انسانیّت کا نہیں بلکہ حیوانیّت کا مظاہرہ ہوتی ہے۔

ہمارے امام ہُمام حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایّدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اپنے خطبات میں اپنی جماعت کو اس امر کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں کہ پبلک مقامات میں جہاں ہجوم ہو جائے، فوراً "کیو" (قطار) بنا لینی چاہیئے۔ پس اگر کوئی احمدی اِس امر سے غفلت کرتا ہے تو وُہ دوہرا مجرم ہے۔ کیونکہ اُس کے امام نے بھی اُس کو اِس طرف توجّہ دِلائی ہے۔ مگر اُس پر کوئی اثر نہیں ہُوا۔

بعض لوگوں کی طرف سے یہ اعتراض ہوتا ہے۔ کہ بعض ادنیٰ طبقہ اور چھوٹی ذہنیّت والے لوگ جب قطار میں کھڑے نہیں ہوتے تو ہم بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ قطار نہ بنائیں۔ یہ عُذر بھی غلط ہے۔ کیا ہمارا فرض نہیں کہ اِس قسم کے لوگوں کی اصلاح کریں۔ اگر چند شرفاء بھی اِس موقعہ پہ کھڑے ہو جائیں اور کہیں دیکھو بھئی قطار بنا لو۔ قطار بنانی پڑے گی۔ تو ایسے لوگ اُن کا مقابلہ نہیں کر سکینگے۔ آخر تبلیغ کسے کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ تو نہیں لکھا کہ عیسائیوں کو مسلمان بناؤ۔ بلکہ یہ لکھا ہے۔

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ

اے مُسلمان تُو دُنیا کے ہر شخص کو جو غلط راستہ پہ چل رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کے راستہ کی طرف بُلا۔ پس ہر مومن کا فرض

ہے کہ وہ جہاں کوئی گمراہی دیکھے۔ اس کی اصلاح کی کوشش کرے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ فَاِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ... وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ۔ (مسلم)

تم میں سے جو شخص کوئی ناپسندیدہ امر دیکھے۔ وہ اگر صاحبِ اختیار ہے تو اپنے اختیار و مرتبہ سے کام لیتے ہوئے اُس کو روک دے۔ اگر ایسا نہیں کر سکتا۔ تو زبان سے نصیحت کر دے یا افسرانِ بالا تک رپورٹ کر دے۔ اگر بزدلی یا کسی اور امر مانع کی وجہ سے ایسا بھی نہیں کر سکتا تو کم از کم دل ہی میں اُسے بُرا منائے اور اُس کے تدارک کے لئے دُعا کر دے۔ لیکن یہ تیسری حالت ادنیٰ قسم کے ایمان کا مظاہرہ ہوگا۔

دیکھو قرآنِ کریم نے ہمیں یہی سبق دیا ہے کہ ہمیشہ صراطِ مستقیم یعنی سیدھا راستہ اختیار کرو۔ اور ہر امر میں اللہ تعالیٰ سے سیدھا راستہ ہی طلب کرو۔ کیا ہنگامہ آرائی، دھکم دھکے اور گالی گلوچ والا راستہ صراطِ مستقیم کے تحت لایا جا سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ نماز باجماعت میں شمولیت کی خاطر گھبراہٹ اور بدنظمی کا مظاہرہ کیا جائے۔ آپ نے کسی نوجوان کو دیکھا کہ وہ نماز میں شامل ہونے کے لئے بھاگا آ رہا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"اَلْوَقَارَ۔ اَلْوَقَارَ"

دیکھو وقار اختیار کرو۔ وقار اختیار کرو۔

اگر نماز میں شمولیت کیلئے بھاگ کر آنا بے وقاری کا مظاہرہ ہے تو ایک سیر راشن یا ایک پاؤ گوشت حاصل کرنے کے لئے اپیل کرنا کیا کہلائیگا؟ قارئین خود ہی سوچ لیں۔

آخر میں میں اپنے عزیزوں سے اپیل کروں گا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی لئے کھڑا کیا ہے کہ ہم دُنیا کے سامنے اسلامی اخلاق کی تصویر پیش کریں۔ پس ہمارے کالج کے طلباء کے سوشل پروگرام میں یہ امر بھی شامل ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے ماحول میں "کیو" (قطار) بنانے کی عادت پیدا کریں۔ زندہ اقوام میں تو صرف اِس امر کے قیام کے لئے بھی سوسائٹیاں قائم ہیں۔ جن کے اراکین اس چیز کی ترویج و اشاعت میں لگے رہتے ہیں۔

چند سال ہوئے پاکستان میں بھی ایسی ایک سوسائٹی قائم ہوئی تھی۔ اُس کا ایک نمائندہ ربوہ بھی آیا تھا۔ طلبہ سے فارم بھی پُر کروائے تھے۔ مگر بعد میں علم نہیں ہو سکا۔ کہ اُس سوسائٹی کا کیا حشر ہوا۔

سوسائٹیوں کے قیام سے بھی ایسے کام کئے جاتے ہیں۔ مگر بحیثیت ایک مسلمان کے اور ایک آزاد اسلامی مملکت کا شہری ہونے کے ہمارا فرض ہے کہ اسلامی اخلاق پر کاربند ہوں اور انکی دُنیا میں اشاعت کریں۔ اسلامی تعلیم کی چھوٹی چھوٹی تفاصیل کا خیال رکھنے سے ہی اپنے مذہب کی اہمیت اور محبت ہمارے دِلوں میں راسخ ہوگی۔ اور ہم ان کی برکات سے حصّہ لیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ کی بھی رضا حاصل کریں گے۔

وَمَا تَوْفِیْقُنَا اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَظِیْمِ۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝

پروفیسر مالک محمد عبداللہ

حدیث شریف

حدیث ایک عربی لفظ ہے جس کے لغوی معنی "نئی بات" کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں حدیث اُس مقدس کلام کو کہا جاتا ہے جو حضرت رسُول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا۔ یا جس میں حضورؐ کی پاکیزہ زندگی کا کوئی واقعہ بیان کیا گیا ہو۔

حدیث شریف کی اہمیت اور ضرورت

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں اگرچہ بہت بعد میں مرتب اور مدون کی گئی ہیں مگر ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ بہت سا دین اور رُوحانی علم اِس بابرکت خزانہ سے وابستہ ہے۔ اور شریعت کے بہت سے اہم مسائل کی تشریح اور وضاحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اس اہمیت کو اللہ تعالیٰ نے اِس طرح بیان فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَ أَطِيعُوا الرَّسُولَ۔ (النساء)

کہ اے لوگو۔ اللہ کی اطاعت کرو۔ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ آپ کے مقدس ارشادات پر عمل کیا جائے۔ اِسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف کی اہمیت اور افادیت کے متعلق خود بھی یہ ارشاد فرمایا ہے۔ کہ

مَنْ حَفِظَ عَلَى أُمَّتِي أَرْبَعِينَ حَدِيثًا فِي أَمْرِ دِينِهَا بَعَثَهُ اللَّهُ تَعَالَى فَقِيهًا وَ كُنْتُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَافِعًا وَ شَهِيدًا۔ (بیہقی)

کہ جو شخص میری اُمت کی بہبودی کی غرض سے چالیس حدیثیں محفوظ کرلے گا۔ اللہ تعالیٰ اُسے قیامت کے دن ایک عالمِ دین اور فقیہ کی صُورت میں کھڑا کریگا۔ اور میں اُس کے لئے خدا کے حضور شفاعت کرونگا۔ اور اس کے ایمان کا گواہ ہونگا۔

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اِس مبارک ارشاد کی وجہ سے کئی علماء حدیث نے "اربعین" یعنی چالیس منتخب احادیث کے مجموعے مرتب کئے ہیں۔ تاکہ لوگ انہیں آسانی سے حفظ کرسکیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق آخرت میں خدا تعالیٰ کی خوشنودی اور رسول مقبولؐ کی شفاعت کے حقدار بنیں۔

صحاح ستّہ

حدیث شریف کی مستند اور صحیح کتب کی تعداد چھ بیان کی جاتی ہے۔ جن کو صحاح ستّہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ کتب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) صحیح بخاری۔ اس کے مؤلف امام محمد بن اسماعیل

بخاری ہیں۔ ان کا زمانہ ۱۹۴ھ تا ۲۵۶ھ ہجری ہے۔ یہ کتاب حدیث کی تمام کتابوں میں زیادہ مستند اور اعلیٰ سمجھی جاتی ہے۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ

اصح الکتب بعد کتاب اللہ البادی اَلْبُخَارِیُّ

یعنی قرآن مجید کے بعد تمام کتابوں سے زیادہ صحت والی کتاب بخاری ہے۔

(۲) صحیح مُسلم۔ یہ حدیث کی کتاب امام مسلم بن حجاج کی تالیف کردہ ہے۔ جن کا زمانہ ۲۰۴ھ تا ۲۶۱ھ ہجری ہے۔ اس کا شمار صحاح ستّہ میں دُوسرے نمبر پر ہے۔ اپنی ترتیب اور تدوین کے لحاظ سے نہایت جامع اور اعلیٰ کتاب ہے۔

(۳) جامع ترمذی۔ امام ابو عیسٰی محمد بن عیسٰی ترمذی نے اسے تالیف کیا۔ ان کا زمانہ ۲۰۹ھ تا ۲۷۹ھ ہجری ہے۔

(۴) سنن ابوداؤد۔ امام ابو داؤد سلیمان بن اشعث نے اسے تالیف کیا ہے۔ انکا زمانہ ۲۰۲ھ تا ۲۷۵ھ ہجری ہے۔

(۵) سنن نسائی۔ امام احمد بن شعیب نسائی کی تالیف ہے ان کا زمانہ ۲۱۵ھ تا ۳۰۶ھ ہجری ہے۔

(۶) سنن ابن ماجہ۔ امام محمد بن یزید ابن ماجہ کی تالیف کردہ ہے۔ ان کا زمانہ ۲۰۹ھ تا ۲۷۳ھ ہجری ہے۔

انکے علاوہ اور بھی بعض قابلِ قدر اور مستند حدیثوں کی کتب ہیں اور ائمہ حدیث نے بڑی کاوش اور محنت سے مرتب کیا ہے اور ایسے زمانہ میں جبکہ سفر کی سہولتیں میسّر نہ تھیں، ان بزرگانِ کرام نے ایک ایک حدیث کیلئے صدہا میل کا سفر کیا اور بڑی تحقیق اور چھان بین کے بعد احادیث کی یہ کتب مدوّن و مرتب کی گئیں۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ بَارِکْ وَسَلِّمْ۔

آہ! شیخ محمد احمد پانی پتی

جیسا کہ قارئین "المنار" کو اخبارات کے ذریعہ علم ہو چکا ہوگا۔ پچھلے دِنوں ملک کے ایک نامور مترجم اور ادیب شیخ محمد احمد پانی پتی عین عنفوانِ شباب میں داعی اجل کو لبّیک کہہ گئے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

شیخ صاحب مرحوم برّصغیر پاک و ہند کے ایک مایۂ ناز مترجم تھے۔ اُردو ادب کی تاریخ آپکی ناقابلِ فراموش خدمات کی مُعترف رہیگی۔ آپکے ترجموں کی رَوانی اور سلاست ایسی بے نظیر ہے کہ بہت کم ترجموں میں ملے گی۔ ہر خاص و عام سے آپ کے تراجم نے سند قبولیت حاصل کی مختصر سی عمر میں آپکا کم و بیش بیس۲۰ نادر علمی اور مذہبی کتب کا اُردو میں ترجمہ کرنا، جن میں بعض کافی ضخیم تھیں، آپکی زبردست علمی صلاحیتوں پر دال ہے۔ ادارۂ "المنار" آپ کی وفاتِ اندوہناک کو ایک عظیم قومی نقصان تصوّر کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا ہے کہ وہ شیخ صاحب مرحوم کو جنّت الفردوس میں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین

لطف الرحمٰن محمود

امتحان سے پہلے!

(اپنے آپ سے معذرت کے ساتھ)

اجی امتحان سے پہلے کیا ہوتا ہے — یہی نا کہ یار لوگ امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ اِس کے علاوہ اگر کچھ اور بھی ہوتا ہے تو پھر سب ہی اُس میں شریک ہوتے ہوں گے — !

جی ہاں۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ میری یا آپ کی کوئی خصوصیت نہیں۔ لیکن بزرگوں کا قول ہے کہ تجربہ کار کی بات زیادہ وزنی ہوتی ہے۔ اللہ کے فضل سے ہم بھی "تجربہ کار" ہیں۔ تجربہ کار کیا اِس شعر کی تفسیر ہیں ؎

عُمرِ دراز مانگ کے لائے تھے چار دن
دو فسٹ ایئر میں کٹ گئے دو سال دوم میں

یا یُوں سمجھ لیجئے کہ — "ہم اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے" —

بہرکیف آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ ہماری بات کا وزن کیا ہوگا؟ اصولی لحاظ سے تو ہماری بات کا وزن چند ماشے تولے نہیں بلکہ کئی من اور ٹن ہونا چاہیئے۔ لیکن یہ "چھوٹا مُنہ اور بڑی بات" — والا معاملہ ہے۔ کیونکہ ہمارا اپنا وزن ہی کوئی بیس سیر ساڑھے گیارہ چھٹانک کے لگ بھگ ہے! خیر آپ ہمارے وزن کو چھوڑیئے "وزنی" بات کو سُننے کی کوشش کیجئے۔

"یادِ ماضی" — کی اکثر لوگ شکایت کرتے ہیں۔ بلکہ کئی حضرات تو اسے "عذاب" بھی بتاتے ہیں۔ عذاب ہے یا ثواب — ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔ اتنا جانتے ہیں کہ کبھی کبھی بھولی بسری باتیں یاد آجاتی ہیں۔ چنانچہ سکول کے دن بھی یاد آتے ہیں۔ ہائے اللہ وہ کیا دن تھے — !! اُن دِنوں میں کسی نے یہ روایت سُنائی کہ کوئی بزرگ تھے — اُن سے کسی نے پُوچھا کہ "حضرت! آپ کے صاحبزادے کیا کرتے ہیں"؟ انہوں نے جواب دیا — "جی — وہ — امتحان — دیا — کرتے — ہیں" — یہ روایت سُن کر ہمارا ماتھا ٹھنکا اور سوچنے لگے کہ یا اللہ وہ صاحبزادے بھی کیا ہیں کہ پاس ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ لکھنے پڑھنے کی صعوبت سے بھی نہیں گھبراتے — اور نہ ہی امتحان دینے سے اُکتاتے ہیں۔ کم از کم انہیں ہر لیپ کے سال تو پاس ہو جانا چاہیئے۔ آخر گوشت پوست کے انسان ہونگے — اینٹ گارے کے تو یقیناً نہیں۔ دِل گُردہ شاید کسی بکرے ہی کا ہو — کیونکہ آجکل "سرجری" کا زمانہ ہے۔ لیکن دماغ تو اپنا ہی ہوگا۔ یا اللہ وُہ پاس کیوں نہیں ہوتے؟" — یہ روایت سُن کر ذہن کو اِس قسم کے خیالات نے روند ڈالا۔ اور ساتھ ہی یہ خواہش دِل میں چٹکیاں لینے لگی کہ اُن صاحبزادے صاحب کے درشن ہو جائیں تو شاید مغفرت کی کوئی صُورت پیدا ہو جائے۔ مگر کوشش بسیار کے باوجود — اُن صاحبزادے صاحب کا اتا پتا نہ مِل سکا۔ ع

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا!

یہ آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ بعض نام بڑے پیارے ہوتے ہیں۔ مگر یہ لفظ "امتحان" تو یرقان سے بھی بدتر ہے۔

اور اس پر طرّہ یہ کہ لوگ بڑے عجیب واقع ہوئے ہیں۔ امتحان کے دنوں کے قریب طالب علموں کے حلقے میں بڑی بے چینی اور گھبراہٹ کا پیدا ہونا ایک طبعی امر ہے۔ اس موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بعض لوگ نصیحتیں کرنے لگتے ہیں۔ اِدھر الجبرے کے جبر سے ناک میں دم ہے۔ اُدھر نصیحت ہو رہی ہے کہ "امتحان کہاں نہیں ہوتے" ــــ اسی اثنا میں کوئی اور صاحب نہ جانے کہاں سے ٹپک پڑیں گے "ارے بھئی۔ کیمسٹری کا شکوہ؟ یہ تو مسلمانوں کا علم ہے ــــ کچھ تو آپ کو خیال کرنا چاہیئے۔" اسی اثنا میں ثواب دارین کے حصول کے لئے کوئی اور صاحب ہم پر ترس کھائیں گے۔ بس کچھ نہ پوچھئے۔ تو بہ ہی بھلی ہے۔ بھانت بھانت کی بولیاں سننا پڑتی ہیں۔ جتنے مُنہ اتنی باتیں ــــ چونکہ ایک چُپ ہزار کو ہرا دیتی ہے۔ اس لئے چُپ سادھ لیتے ہیں ــــ خیر یہ "نصیحتیں" ــــ امتحان کی آمد کی پہلی نشانی ہے!!

پھر جُوں جُوں امتحان قریب آتا جاتا ہے، توں توں "قیامت کی نشانیاں پُوری ہوتی جاتی ہیں" بلکہ روزِ محشر کی نفسا نفسی کا نظارہ تو چھوٹے پیمانے پر پہلے ہی نظر آجاتا ہے۔ طالب علموں کی حالت پتلی ہو جاتی ہے۔ کتابی کیڑوں پر تو "جان کنی" کی حالت طاری ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ یٰسین سُنانے کا وقت ہوتا ہے۔ اُنہیں ابھی سے یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ "فرسٹ کون آتا ہے؟" ــــ بلّی کو بچھیچھڑوں کی خوابیں آتی ہیں نا ــــ پھر یہ کہ کس کس کالج میں کورس COVER ہوا ہے۔ پھر مزید یہ کہ فلاں پرچہ کس "ایگزامینر" نے ڈالا ہے۔ اس ٹولے سے تعلق رکھنے والے دو چار طلبہ جہاں بیٹھتے ہیں وہیں سینٹ پال کی ایک برانچ کھل جاتی ہے۔ اُس وقت ان حضرات کی جولانیِ طبع اور پروازِ تخیّل ــــ حیران کُن ہوتی ہے ــــ ان حضرات کی دِلی خواہش ہوتی ہے کہ بورڈ یا یونیورسٹی کے اربابِ اختیار پرچوں کے حل سر بمُہر لفافوں میں امتحان سے کافی عرصہ پہلے بذریعہ رجسٹری اُن کی خدمت میں بھیجکر دُعا لیں۔ باقی طالب علموں کے بھی کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حتّیٰ کہ دوستوں کا آپس میں ملنا جُلنا بھی کم ہو جاتا ہے۔ البتہ کسی کے ہاں اگر "گیس پیپر" آئے ہوں تو پھر کیا کہنے۔ گویا بارات آجاتی ہے۔ ! یہی "نایاب" طلبہ اصحاب کہف کی غاروں سے آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے وہاں یاروں کا "کیو" (Q) لگ جاتا ہے ــــ گویا گیس پیپر نہیں امریکہ سے "ایڈ" (Aid) آئی ہے۔ یُوں سمجھ لیجئے کہ وہ یار دوست جو عام دنوں میں "منکر نکیر" کی طرح ہر وقت کندھوں پر سوار رہتے ہیں۔ امتحان کے قریب ایسے غائب غُلّہ ہوتے ہیں کہ جیسے شیطان لاحول پڑھنے سے بھاگ جاتا ہے۔ اگر ہمّت کر کے ان میں سے کسی ایک کے گھر تک گرتے پڑتے پہنچ بھی جائیں تو امتحانی لاحول کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ اندر سے بدحواسی کے عالم میں آواز آتی ہے ــــ "محمود صاحب میں گھر پہ نہیں ہوں"۔ سوتے کو جگانا تو آسان ہے۔ یہاں جاگتے کو کون جگائے۔ ! مختصراً یُوں سمجھ لیجئے کہ امتحان کے ایّام میں "یارانِ کہن" کو چھُوت کی بیماری لگ جاتی ہے اور طبّی لحاظ سے حفظ ماتقدم کے طور پر ملنا جُلنا ممنوع ہو جاتا ہے ــــ یہ "چھُوت کی بیماری" امتحان کی آمد آمد کی دُوسری بڑی خصوصیّت ہے؟

امتحان کے قریب افواہیں بڑی کثرت سے پھیلتی ہیں۔ جوں جوں پرچہ مشکل آنے اور Marking سخت ہونے کی افواہیں پھیلنا شروع ہوتی ہیں، توں توں طلبہ میں تقویٰ اور خشیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ بعض "پہارو" جو عام دنوں میں گویا ہر وقت "فری شائل دنگل" کے موڈ میں رہتے ہیں۔ ان دنوں میں نرے اصیل مرغ بن کر رہ جاتے ہیں۔ کئی چہرے چوسے ہوئے آم کی طرح نکل آتے ہیں!! "ٹیڈی ازم" کی برکت سے ٹانگوں پر گھٹنیاں چڑھانے والوں کو ان دنوں دھوتی کی بھی خبر نہیں رہتی۔ کئی اصحاب تسبیح رولنے لگتے ہیں۔ کئی مسجدوں کی صفوں کی جھاڑ پھونک شروع کر دیتے ہیں۔ کئی دو دو گھنٹے پہلے ہی اذان دے دیتے ہیں۔ بہرحال شعارِ اسلامی پہ امتحان کا مفید اثر پڑتا ہے ــــ امتحان کی آمد کی تیسری خصوصیت یہی خشیت ہے!

ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ گھر میں سب کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ امتحان کی تیاری ہے۔ کوئی مذاق نہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ گھر میں جُپ کے روزے رکھ لئے جاتے ہیں۔ گلی میں ڈونڈی پٹ جاتی ہے کہ صاحبزادے صاحب نے امتحان کی "نیت" کر لی ہے۔ وقت تھوڑا رہ گیا ہے۔ یہی کوئی تین چار مہینے باقی ہیں۔ !! لہذا اڑوس پڑوس کے "بابا لوگ" اپنے "فالتو" بچوں کو گھروں میں باندھ کر رکھیں۔ ورنہ ہم خاندانی منصوبہ بندی کے سنٹر میں رپورٹ کر کے ان فالتو بچوں کو "بلیک لسٹ" کرا کے دم لیں گے۔ !!

اس ڈونڈی کے بعد ہمیں "نظرِ بد" سے بچانے کیلئے نظر بند کر دیا جاتا ہے۔ سیاسی قیدی کی طرح کمرے میں پڑے ہیں۔ کتابیں ہیں اور میاں صاحبزادے ہیں! علمی اور ادبی رسائل کا داخلہ قانوناً ممنوع ہو جاتا ہے۔ گویا یہ "اشتراکی لٹریچر" ہے۔ کبھی کبھی "ہوم گورمنٹ" اور چھوٹے بھائیوں کی سی، آئی، ڈی ــــ چھاپے مارتی ہے۔ اور "باغیانہ لٹریچر" کی ٹوہ میں رہتی ہے۔ پہلے ہی حواس بجا نہیں ہوتے کہ یہ نئی آفتیں گلے پڑ جاتی ہیں۔ یہ غم رہتا ہے کہ فزکس اور کیمسٹری کی کتابوں کے ٹائٹل کس دیوان اور رسالے پر چڑھائے جائیں۔ پھر یہ "سی۔ آئی۔ ڈی" بڑی "کائیاں" ہے۔ دیوانِ غالب اور "آرگینک کیمسٹری" کی مندرجات سے خوب واقف ہے۔ اور اپنی رپورٹ نہایت محنت سے مرتب کر کے ہمارا ستیاناس کراتی ہے!

اِس سلسلہ میں صحت کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ امتحان کے قریبی ایام میں صحت کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ کمرے میں کتابیں ہیں یا گیس پیپر ــــ یا دوائیں ہیں یا دواؤں کے اشتہار! گلوکوز موجود ہے۔ تاکیمسٹری کے کسی دو مربعے گز فارمولے کو دیکھ کر اگر صاحبزادے صاحب کا دل بیٹھ جائے تو پھر اُسے کھڑا کیا جا سکے! اور بھی بہت کچھ ہے۔ غرض جیل کے اندر لائبریری اور اُسکے اندر ایک "ڈسپنسری" محض ہماری صحت کو تباہی سے بچانے کیلئے قائم کی جاتی ہے! اِس عالم میں اگر کوئی چھینک آجائے تو پھر گھر کے لوگ "درِ زنداں" تک دوڑ کر آتے ہیں۔ اور پوچھ گچھ شروع ہو جاتی ہے۔ "یہ کیا تھا!" ــــ "چھینک؟" ــــ "...... کو چھینک آگئی؟ امتحان کے دنوں میں؟" ــــ "اللہ رحم کرے چھینک آگئی ہے!! پھر یہی اطلاع "درخواستِ دعا" کی شکل میں "لجنہ اماء اللہ" کے اجلاس میں چلی جاتی ہے۔ ایک نقل مسجد میں حافظ جی کے پاس

اور دُوسری "الفضل" میں بلغرضِ اشاعت !!

اگر اسی پر بس ہو جائے تو سمجھیئے سستے چھوٹے۔ مگر نہیں صاحب چھینک آئی ہے اور وُہ بھی امتحان کے دِنوں میں ـــــ قرآن سر پر رکھیئے ـــــ اللہ رسول کا واسطہ دیجئے۔ کہ جی چھینک وغیرہ کچھ نہیں تھی۔ یہ میز ہِل گئی تھی ـــــ مگر کون سُنتا ہے۔ گھر والوں نے: امتحان کے خاتمے تک ہمارا "ریمانڈ" لیا ہوُا ہے۔ جو چاہیں کریں ـــــ ایسی حالت میں کیا تیاری ہو سکتی ہے۔ بلکہ میرے معذرت کے ساتھ یہی کہہ سکتے ہیں ـــــ ع

ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے تیاری کی !!

پھر امتحان کے قریب خیالات کی یکسوئی بڑی نعمت ہے، اِس نعمت کا صحیح احساس امتحان کے دِنوں میں بڑی شدت سے ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے یہ نعمتِ غیر مترقبہ ہمیں کس طرح فراہم کی گئی! بند کمرے میں بند ہیں۔ روشندان بھی بند ہیں۔ اچھا جی وہ کیوں بند ہیں؟ وُہ اِس لئے بند ہیں کہ چڑیاں چُوں چُوں کر کے صاحبزادے صاحب کو "DISTURB" نہ کریں۔ یا پھر گھونسلوں سے تنکے نہ گرائیں۔ جی ہاں یہ وُہی گھونسلے ہیں جو صاحبزادے نے جذبۂ خدمتِ خلق سے سرشار ہو کر چڑیوں کی رہائش کے لئے خود تیار کئے ہیں! یہ تنکے نہ ہوئے چھت کی کڑیاں ہو گئیں۔ اگر گر پڑیں تو صاحبزادے صاحب اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو یونیورسٹی کا ریکارڈ کون توڑے گا؟ اِس لئے صاحبزادے صاحب کا دُنیا میں زندہ رہنا بڑا ضروری ہے !! ایسے عالم میں یکسوئی خاک ہو ـــــ دِل تو ہمیں اللہ میاں نے گوتم بُدھ کا دیا ہے، اور ماحول کالنگا کی لڑائی کا ـــــ ! اب دِل دھک دھک کر رہا ہے کہ چڑیوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے ـــــ انہیں کیوں دیس نکالا ملا ہے ! اِس جلاوطنی کا وبال کِس پر آئے گا۔ فزکس کے پرچے پر۔ یا کیمسٹری کے پریکٹیکل پر۔ یا سارے کالج پر !! خیالات کی یکسوئی کا یہ عالم ہے کہ رات کو بھی نیند نہیں آتی۔ جی چاہتا ہے کہ جلد سو جائیں۔ شاید کوئی پرچہ خواب میں ہی نظر آجائے ـــــ مگر یہ مُنہ اور مسور کی دال ! اِس "کشف" کے انتظار ہی میں وُہ دن آجاتا ہے۔ ع

دِن گِنے جاتے ہیں جس دِن کیلئے

اَب آپ خُدا لگتی کہئے۔ کہ ایسی تیاری سے کون پناہ نہیں مانگتا ! تیاری نہ ہوئی اچھا خاصا "مرن برت" ہوُا۔ خیال ہوتا ہے کہ پاس ہونے کی بجائے اگر "پاس آوے (PASS AWAY) ہو جائیں۔ تو سستے چھوٹیں گے ! ایسی تیاری کے بعد کوئی کیا امتحان دے۔ پرچے میں کیا خاک لکھے۔ ہانڈی میں ہوگا سو ڈوئی میں نکلے گا ! آپ ہی فیصلہ کیجئے کہ جس صاحبزادے کو تیاری کے لئے ایسا نادر موقع ملے، وہ فیل نہ ہو تو کیا پاس ہو؟

كُلُّ مَوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ أَوْ يُنَصِّرَانِهٖ أَوْ يُمَجِّسَانِهٖ (الحدیث)

ترجمہ:۔ ہر پیدا ہونے والا (بچہ) فطرتِ (صحیحہ) پر پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر اُس کے والدین اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔

(مرسلہ:۔ محمد انور قریشی)

قریشی اعجاز الحق
سیکنڈ ایئر بی۔ اے

"اصلاحِ معاشرہ"

کسی قوم کے عروج و ارتقاء کے لئے جن اہم عناصر کا ہونا لازمی ہے، ان میں سے صحت مند معاشرے کا وجود بہت زیادہ اہمیّت رکھتا ہے۔ جب تک معاشرے میں سرائت شدہ خرابیوں کا قلع قمع نہ کیا جائے، کوئی قوم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتی۔

یُوں تو خالقِ حقیقی نے عالمِ رنگ و بو کے تمام کرداروں کو نفسِ واحد سے تخلیق کیا ہے اور ہر شخص کو نیک فطرت ودیعت کی ہے۔ مگر شیطانی حیل کی وجہ سے انسان بعض دفعہ بُرے راستوں پر چل پڑتا ہے۔ اور اِس طرح معاشرے میں بُری رسومات اور بُرے خیالات جنم لیتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ بُرائیاں مستقل حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ پاکستانی معاشرہ میں بھی انسدادِ زمانہ سے بعض ایسی باتیں وجود میں آگئی ہیں جو معاشرے کے صحت مند ارتقاء کے لئے سدِّ راہ ثابت ہو رہی ہیں۔ ان بُرائیوں کی بیخ کنی کیلئے مُناسب قدم اُٹھانا ارباب اختیار کا فرض ہوتا ہے۔ چنانچہ ہماری موجودہ حکومت نے اِس بارہ میں مستحسن قدم اُٹھائے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جب تک عوام الناس اس بارہ میں حکومت کی مدد نہ کریں، ایسی باتوں کا مکمل استیصال ناممکن ہے۔ ہم اپنی قسمت کے خود معمار ہیں۔ اِس لئے ہمیں قومی ارتقاء کے حصول کی خاطر اور اپنے مستقبل کو درخشاں بنانے کے لئے بُرائیوں کا کماحقہٗ انسداد کرنا چاہیئے۔

اگرچہ مسلمانانِ پاکستان کو فرنگ کی اسیری سے آزاد ہوئے چودہ سال بیت چکے ہیں مگر یہ شومئی تقدیر ہے کہ مغربی تہذیب و معاشرت کی تقلید نے نوجوانانِ وطن کے ذہنوں کو پابند سلاسل کیا ہوا ہے۔ ماسوائے چند ان میں سے اکثر لادینیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان میں اسلامی رُوح کا فقدان ہے۔ وُہ اپنی کوتاہ نظری اور بے بصری کے سبب، مغربیت کے دامن ہائے دراز میں پناہ گزین ہو رہے ہیں۔ انہوں نے مغرب کا سُرمہ آنکھوں میں ڈال لیا ہے مگر وُہ اسکی بے نُوری سے واقف نہیں ہیں۔ بڑے شہروں میں ٹیڈی بوائیز دیکھنے میں آتے ہیں جنہوں نے شرم و حیا کا جُبّا اُتار پھینکا ہے اور لیل و نہار کی ہر ساعت ناشائستہ حرکات کا منظرِ عام ارتکاب کرتے ہیں۔ اگر یہی حالت جاری رہی تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا ع

جس کی بہار یہ ہو پھر اُس کی خزاں نہ پُوچھ

مغربی تہذیب کی تقلید کے نتیجہ میں فحاشی، بے حیائی، منشّیات اشیاء کا استعمال اور فضول خرچی ایسی مُہلک بیماریاں یہاں آگئی ہیں۔ سینما گھروں میں بعید از اخلاق فلمیں دِکھائی جاتی ہیں۔ جو مغربی ممالک سے ہی منگوائی جاتی ہیں۔ وُہ نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑنے میں جلتی پر تیل کا کام کرتی ہیں۔ کیونکہ انسان کی نظر جب مختلف اشیاء کو دیکھتی ہے تو مختلف رنگ میں ان کا اثر قبول کرتی ہے۔ فلمی عورتوں کو دیکھنے سے بھی انسان

کے دل پر ایک اثر ہوتا ہے اور چونکہ مرد و عورت کو ایک جنس سے پیدا کیا گیا ہے اور دونوں کے جذبات میں یکسانیت اور ہم آہنگی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اسلئے ایسی فلمیں شدید طور پر انسانی نفس پر اثر انداز ہوتی ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سینما دیکھنے والے فلمی کرداروں کی نئی اور اچھوتی وضع قطع، ناز و انداز، اور رفتار و گفتار اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ بُرائی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے متعلقہ حکّام کا فرض ہے کہ وہ سینما کے وجود کو یہاں سے ناپید کریں۔ اگر ایسا نہیں کیا جا سکتا تو فلموں کو سنسر کرتے وقت تشدّد سے کام لیا جائے۔ تاکہ ایسی فحش اور عُریاں فلمیں منظرِ عام پر نہ آ سکیں اور نوجوان حتی الوسع ان کے بُرے اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

اس کے علاوہ بے شمار ایسی باتیں ہیں جو معاشرہ کی خرابی کا باعث بنی ہوئی ہیں اور قوم کی نئی پود کو اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھائے جا رہی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ابھی ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اسکی اصلاح کیلئے پُوری جدّ و جہد کی جائے۔ تاکہ جب یہ منزل مقصود پر پہنچے تو صحیح رنگ میں اسلامی رُوح اسکے اندر موجود ہو۔ صحیح رستہ وُہی ہے جو اسلام دکھاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سینما کے وجُود، فلمی گانوں کی گرم بازاری اور فحاشی کو سرے سے ہی ناپید کر دیا جائے۔ بلکہ حفظِ فروج، غضِّ بصر اور عفّت کو قائم کیا جائے۔ اگر نوجوانوں کے فطری جذبات اور میلانات پر شدید بندشوں اور امتناعات کا پہرہ نہ لگایا جائے اور انکی طفلانہ حرکات کو جو کہ ان جذبات کی پَرتو ہیں سلیقہ چھڑی اور اصلاح کی قینچی سے سُدھار کر شریفانہ نہ بنایا جائے۔ اور اخلاق کے ضوابط اور قانون کی تحدیدوں پر سختی سے عمل درآمد نہ ہو تو انسان پھر اشرف المخلوقات نہیں بلکہ ارذل المخلوقات ہی بنتا چلا جائے گا۔ اور انسانیّت اور بہیمیّت میں فرق باقی نہ رہیگا۔ اسلئے اسلام معاشرے کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے۔

اسلام میں خدا تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرنے پر بہت زور ہے۔ اگر ہم خدا تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کر لیں تو یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ ہم بُرائی کے مُرتکب ہوں۔ جو شخص خدا تعالےٰ کا خوف رکھتا ہے اور بُری باتوں سے احتراز کرتا ہے۔ وُہ جنّت کا حقدار ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

"وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى"۔ یعنی جس نے اپنے رب کے بلند و برتر مقام سے خوف کیا اور اپنے نفس کو گری ہوئی خواہشات سے روکا تو یقیناً جنّت ہی اُس کا ٹھکانا ہے۔

اگر ہر شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور خدا کے خوف کو دِل میں جگہ دے اور بُرائیوں سے بچے، تو چند دِنوں میں یہ دُنیا جنّت نما بن سکتی ہے۔ ہادی برحق علیہ التحیات والتسلیمات کا ارشاد ہے "كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ"۔ یعنی ہر شخص اپنے دائرہ کے اندر ایک حاکم کی حیثیّت رکھتا ہے اور تم میں سے ہر ایک کو اپنے ماتحتوں کے متعلّق پُوچھا جائے گا۔ اِس سے ثابت ہے کہ ہر انسان پر کچھ حقوق اور ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اور یہ لطیف حدیث اِسی بات کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ کہ بادشاہ سے لیکر غلام۔ اور جرنیل سے لیکر سپاہی تک

سب اپنے اپنے دائرہ عمل کے اندر حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔ اور ہر شخص اپنے ماتحتوں کی اصلاح کا موجب بن سکتا ہے۔

اگر قوم کے لیڈر، ملک کے اخبارات عوام الناس کے دلوں میں، اور کالجوں کے پروفیسران اور سکولوں کے اساتذہ طلباء کے دِلوں میں، اور والدین اپنے بچّوں کے دِلوں میں نیک جذبات پیدا کر دیں۔ اور اُن میں خدا کی محبّت، رسُولؐ کی محبّت اور دین کی محبّت کے پہلو بہ پہلو قوم کے درد اور خدمت و ایثار کی رُوح پیدا کر دیں تو پھر نیک اعمال کیلئے راستہ خود بخود ہموار ہوتا چلا جائیگا۔ کیونکہ معاشرتی اِصلاح کیلئے سب سے پہلے قلوب کی اصلاح اور تطہیر ضروری ہے۔

اگر ہم اسلام کے سنہری اُصولوں پر پُورے طور پر کاربند ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ملک میں معاشرت کی خرابیاں باقی رہیں۔ ضروری ہے کہ اسلامی اخلاق کو قائم کرنے کے لئے ٹھوس اقدامات کئے جائیں اور اِس بات غور کیا جائے کہ کیا اِسلام ہمیں مغربی تہذیب و تمدن کی تقلید کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ اسلامی شعار کو ترک کر کے دُوسری اقوام کی مشابہت اختیار نہ کی جائے۔

حضرت شارع علیہ السلام کا قول ہے:۔

"مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ" (ابوداؤد)

کہ جو شخص اپنی ملّت اور قوم کا طریق چھوڑ کر کسی دُوسری قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اُس قوم میں سے سمجھا جائیگا۔ اِس لطیف حدیث کے ذریعہ سے آپؐ نے مُسلمانوں کو ہوشیار فرمایا ہے کہ وہ کبھی کسی قوم کے طریق تمدن و معاشرت کے نقّال نہ بنیں۔ بلکہ اسلام کی تعلیم کو ساری دُوسری تعلیموں پر، اور اسلام کے تمدن کو سارے دُوسرے تمدنوں سے بہتر اور ارفع خیال کر کے اسلامی شعار اختیار کریں۔ ورنہ وہ ایک بدترین قسم کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہو کر اپنی ممتاز ہستی اور ارفع انفرادیت کو کھو بیٹھیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ اپنے آقاؤں کی اِس حکیمانہ تعلیم کے باوجود آجکل مُسلمانوں نے مغربی ممالک کی بدترین ذہنی غلامی اختیار کر رکھی ہے۔

مغربی تمدن و معاشرت کی ذہنی غلامی سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ حتی الوسع اسکی بیخکنی کیجائے۔ تاکہ ہم کسی رنگ میں بھی مغربیت کے رنگ میں رنگین نہ ہوں۔ موجودہ زمانہ کی حالت وہی ہے جو آج سے چودہ سو سال پیشتر آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل دُنیا میں نظر آتی تھی یعنی ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ خشکی و سمندر میں فساد ہو چکا تھا۔ تمدن اور معاشرت کی خرابیاں بنی نوع انسان کی تکلیف کا باعث بنی ہوئی تھیں اور شیطان انکے بُرے اعمال کو انکی نظروں میں خوبصورت کر کے دکھلاتا تھا۔ آج بھی شیطان لوگوں کو گمراہی کی تاریک راہوں میں لئے جا رہا ہے۔

پس اگر ہم مُسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمیں مغربی معاشرت کے ان گندے جراثیم کو جو ہمارے معاشرہ میں داخل ہو چکے ہیں ہلاک کرنا ہوگا اور اِس تہذیب کی قائم کردہ اقدار کو بدلنا ہوگا۔ کیونکہ یہ تہذیب مولائے حقیقی کی نظر میں ذلیل ہے۔ دائمی عزّت خُدا اور رسُولؐ اور صحیح رنگ میں اسلام پر عمل کرنے والوں کو ہی مل سکتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (منافقون)

اِسلامی رُوح کے علمبرداروں کو ہی لافانی توقیر حاصل ہوگی۔ اِسلئے ہمیں چاہیئے کہ ہم اِسلام کے پیش کردہ سنہری اُصولوں کو اپنائیں۔ اگر ہم ایسا کر لیں تو ایک صالح اور صحت مند معاشرہ بہت جلد پیدا ہو سکتا ہے۔ یہ وقت ہے کہ ہم اِسلامی معاشرے کو اپنے ہاں رواج دیں تاکہ خدا تعالیٰ ہمیں معاشرت کی موجودہ بُرائیوں اور اندھیروں سے نکال کر اپنے نُور کی ابدی روشنی سے ہمارے دِل منوّر کرے۔ اور صحیح رنگ میں مومن بننے کی توفیق عطا فرمائے۔

وَمَا تَوْفِيْقُنَا اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

سمیع اللہ قریشی
ایم۔اے

عبدالقادرؒ یاد رہیگا!

دس سال قبل میں اپنی محبوب درسگاہ تعلیم الاسلام کالج لاہور میں داخل ہوا تھا۔ جب چچا مجھے داخل کرانے کیلئے لے گئے تو ہوسٹل کے قریب سے گذرے۔ لحیم و شحیم بارعب ڈھیلا ڈھالا کُرتہ اور شلوار پہنے ایک شخصیت نظر آئی۔ میرے ایک دوست جو مجھ سے سینئر تھے اور میرے ہمراہ تھے فوراً بولے "یہ پروفیسر اخوند عبدالقادر ہیں — وائس پرنسپل — انگریزی پڑھاتے ہیں"

اُن کے پڑھانے کا انداز بھی خوب تھا۔ خصوصاً ڈرامہ اور نظم — واہ واہ کیا چٹخارے دار انگریزی بولتے تھے۔ اب بھی آنکھیں بند کرکے گم سُم بیٹھ جاؤں اور ذہن میں کولرج کی "کرسٹابل" یا بائرن کی "پہلی محبت" کے مصرعے دُہرانے لگوں، تو بند آنکھوں میں یادوں کے تخیلی اُجالے میں اخوند عبدالقادر سامنے آجاتے ہیں۔ وجیہ، بلند و بالا ٹھوڑی پر ہلکی سی سفید داڑھی — خوبصورت شیروانی۔ سفید شلوار۔ پاؤں میں انگریزی جوتا سر پر پگڑی اور ان سب کو سمیٹے ہوئے ایک پھیلا پھیلا سا گاؤن۔ کلاس میں آتے۔ کتابیں میز پر رکھ دیتے۔ حاضری کا رجسٹر کھولنے سے قبل کیس میں سے عینک نکالتے۔ پھر اسے کھٹ سے بند کرکے رکھ دیتے۔ پگڑی اُتار کر میز کے ایک کونے میں ٹکا دیتے۔ اَب اُن کے سر پہ صاف شفاف چاندی جیسے بال نمایاں ہو جاتے۔ جس کتاب کو پڑھانا مقصود ہوتا، اُسے اپنے سامنے کھول کر رکھ دیتے۔ ایک پیریڈ بھی بعض اوقات صرف ایک مصرعے کی وضاحت کے لئے ناکافی ٹھہرتا۔ اُن کا کہنا تھا کہ شعر کا مطالعہ اُس وقت تک بے جان ہے جب تک اُسے دل و دماغ اور رُوح کی مکمل ہم آہنگی میسّر نہ ہو۔ پھر وُہ اپنے ساتھ اپنے طلباء کو بھی بائرن، کیٹس، شیلے، کولرج اور شیکسپیئر کی آوارہ رُوحوں کے ساتھ نہ جانے کہاں کہاں لئے پھرتے۔ ساری جماعت پر ایک سحر زدہ خاموشی کی سی کیفیت طاری رہتی۔ کیا مجال تھی کہ یہ خاموشی ناروا آواز سے ٹوٹ جائے۔ وُہ شعر کا کچھ اِس طرح تفصیلی اور ہمہ گیر تجزیہ کرتے کہ تشنگی کا کوئی احساس تک باقی نہ رہتا۔ پڑھانے کے دوران کبھی خود بھی موج میں آجاتے۔ کھو جاتے اور اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلتے رہتے، بولتے رہتے۔ اور کبھی اپنی شیروانی کی دونوں سامنے کی جیبوں میں عجیب انداز سے ہاتھ ڈال کر یُوں کھڑے ہو جاتے جیسے کوئی مجسمہ ہو۔ جو ہلتا جُلتا نہیں۔ مگر معانی اور الفاظ کا دریا بہا چلا جا رہا ہے، پگڑی اِس دوران میں کبھی پہن لیتے کبھی اُتار دیتے۔ الفاظ اُن کے اپنے قول کے مطابق بلاشبہ اُن کے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے کہ جسے حکم ہو وہ آگے آئے۔

پہلے سال ہی کا ذکر ہے کہ میں نے جہاں اُردو میں ایک نظم کہہ کر اُستاذی فیضی صاحب کے حوالے کی وہاں ایک

ہلکی پھلکی نظم اُردو ہی کے چند فقرے لکھ کر اُنکا انگریزی میں ترجمہ کرکے کچھ اِس طرح کہ اشعار کی سی شکل بن جائے اخوند صاحب کے کمرہ میں بھی ایک لفافے میں بند کر کے چپکے سے ڈال آیا۔ دُوسرے دن چپڑاسی کے ہاتھ مجھے بُلوا بھیجا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں ڈر گیا۔ خوف یہی تھا کہ انگریزی میں نظم تو لکھ لی ہے، اب جب وُہ انگریزی میں مجھ سے بات کریں گے، تو جواب کون دے گا۔ پر میں ہمت کر کے اُن کے حضور اُن کے رہائشی کمرے میں چلا ہی گیا۔ وُہ نماز کی تیاری میں مصروف تھے۔ مجھے دیکھا تو کھل کھلا اُٹھے۔ انہوں نے بازو سے پکڑ کر مجھے خود کُرسی پر بٹھا دیا۔ نظم نکال لائے۔ ایک ہی سانس میں کھٹ سے پڑھ گئے۔ مجھ سے کہا، تم سُناؤ۔ اَب میری یہ حالت کہ جگہ جگہ گلے میں کوئی چیز جیسے اٹک سی جاتی ہو۔ سُنتے رہے۔ مُسکراتے رہے۔ کچھ تعریف بھی کی، وعدہ کیا کہ اسے آئندہ شمارے میں "المنار" میں شائع کر رہا ہوں۔ تم کوئی نثر میں بھی مضمون لکھو۔ پھر میں نے اجازت چاہی اور اُٹھ آیا۔

رسالہ چھپ گیا اور انگریزی اور اُردو دونوں نظمیں شاملِ اشاعت ہُوئیں۔ پھر اگلے چند شماروں میں کچھ اُردو کی اور نظمیں چھپ گئیں۔ حتّٰی کہ مجلسِ ادارت میں بھی مجھے شامل کر لیا گیا۔

بی، اے کے دونوں سالوں میں وہ ہمیں ڈرامہ اور نظم پڑھاتے رہے۔ اُن کے پڑھانے میں اس قدر لطف محسوس ہوتا تھا کہ اکثر سائنس کے طلباء بھی ہمارے آرٹس کے گروپ میں آ بیٹھتے۔ مجھے یاد ہے ورڈز ورتھ (Words worth) کے صوفیانہ کلام کی تشریح و تفسیر وہ بڑے مزے لے لے کر کیا کرتے تھے۔ کبھی قرآنِ حکیم کی کوئی آیت، کبھی اقبال کے اشعار وُہ بڑی روانی اور بے ساختگی کے ساتھ اپنے لیکچر میں سمیٹتے جاتے۔ اُن کے درس کی روانی میں بھی ایک سلیقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے فقرات اور نئے نئے خوبصورت محاورات بیان کی چادر پر موتیوں کی طرح جُڑتے چلے جاتے۔ فقرات کی بندشوں اور مرصع تراکیب سے اپنی گفتگو اور کلام کو خوشبودار اور رنگین بناتے۔ ساری جماعت پر خاموشی چھائی رہتی۔ کیا مجال کہ کبھی جو کسی کو شرارت کا خیال تک آیا ہو۔ اور وُہ اِسی قسم کی صحبتوں میں ملٹن، شیکسپیئر، اور ورڈز ورتھ کے اشعار کے وُہ وُہ نکات بیان کرتے کہ یہی جی چاہتا کہ بس سُنتے چلے جائیں اور کاش آج شادی پیریڈ (Period) بجانا بھول جائے۔ لیکن شادی عین وقت پر گھنٹی بجا دیتا۔ اور اخوند صاحب وہیں جیسے رُک سے جاتے۔ عینک اُتار کر کیس میں، پھٹ سے بند کر کے پگڑی سر پر جماتے اور "تھینک یو" کہہ کر چلے جاتے۔

اُنہیں اپنے ہر طالب علم سے محبّت تھی۔ جو لڑکے کامیاب ہو کے چلے جاتے۔ اُن سے بھی بعد میں خط و کتابت رکھا کرتے۔ ملتے تو عزّت اور محبّت سے ملتے۔ ہر لڑکے کا نام اور رول نمبر اُنہیں زبانی یاد ہوتا۔ اُن کا حاضری کا رجسٹر بے حد صاف سُتھرا تھا۔ کہیں کوئی داغ دھبّہ نہ ہوتا۔ اگر کہیں سیاہی گر جاتی، تو اُنہیں بہت دُکھ ہوتا۔ سب سے زیادہ حاضر باش طالب علم کی

بڑی تعریف کرتے۔ اتفاق سے بی۔ اے کے دونوں سالوں میں میری حاضریاں اُن کے پیریڈ میں سب سے زیادہ تھیں اس لئے دوسرے لڑکوں کو میری مثال دیا کرتے۔ اُنہوں نے کبھی کسی کو جُرمانہ نہ کیا تھا۔

اُن کے نظم پڑھانے کا انداز بھی خوب تھا۔ کسی لفظ کے معانی بیان کرنے پر آتے تو انگریزی میں متبادل الفاظ کا ڈھیر لگا دیتے۔ اُردو کے الفاظ بھی کبھی کبھی بتا دیا کرتے۔

پوپ (Pope) کی نظم "ریپ آف دی لاک" (Rape of the lock) پڑھانے لگے تو صرف عنوان ہی کے اِس قدر اُردو تراجم پیش کر گئے کہ ہم سب حیران رہ گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ مَیں اُن سب متبادل الفاظ کو نظم کے ساتھ ہی حاشیئے پر لکھتا گیا تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ تھے۔

انہی دِنوں مَیں نے اُن کے بارے میں ایک نظم لکھی جو "المنار" میں شائع ہُوئی اور خاصی پسند کی گئی۔ اُس نظم کی ہیئت کچھ یُوں تھی۔ ؎

عبدالقادر ایک کتاب
پڑھتے جاؤ ختم نہ ہوگی
اُس کے لاکھوں باب

کالج سے کامیاب ہو کر فارغ ہونے کے بعد ہی کا ذکر ہے کہ اُن کی پیاری سی ننھّی مُنّی بچّی کی وفات کی خبر سُننے میں آئی۔ مَیں نے ملتان انہیں تعزیت کا خط لکھا۔ تو شدید صدمے سے دوچار ہونے کے باوجود فوراً جواب دیا۔ لکھا تھا۔ "عزیزم مکرم۔ پیامِ تعزیت نے دِل کو تڑپا دیا۔ اور میری محبوب و معصوم بچّی کی طویل و شدید علالت جس سے وُہ جانبر نہ ہو سکی، کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا۔ جبکہ زندگی اور موت اس کی ننھّی جان کے لئے نبرد آزما تھیں۔ زِندگی ہاری اور موت کی جیت ہوئی۔"

پھر دن گذرتے گئے اور مَیں کالج سے فارغ ہونے کے بعد کسبِ معاش کی اُلجھنوں میں پھنس گیا۔ اس دوران شاید ہی کبھی ملنا ہُوا ہو۔ ایک خط اُن کا پھر مجھے موصول ہُوا جو افسوس ہے محفوظ نہ رہ سکا۔ اَب اپنی پُرانی ڈائری کے صفحات اُلٹ رہا ہوں تو ۱۳ دسمبر ۱۹۵۵ء کا صفحہ سامنے آگیا۔ غالباً اخوند صاحب ہی کی شخصیّت کو ذہن میں رکھ کر لکھا ہے۔ "تاثرات کی مثال اس آئس برگ کی سی ہے۔ جو سمندر میں پانی کی سطح پہ تیرتا ہے۔ اُس کی صرف چوٹی سطحِ آب سے باہر ہوتی ہے۔ جو سُورج کی شعاعوں میں چمکتی ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کہ برف کے اس تودہ کے نیچے کتنا بڑا پہاڑ ہے جو سمندر کی تیز رَو میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن دیکھنے والوں کی آنکھوں سے اوجھل۔

آج کی شام بڑی خوبصورت تھی۔ سیلونی کے چائے خانے میں بیٹھے تھے کہ استاذی اخوند عبدالقادرؒ بھی تشریف لے آئے۔ (میرے واجب صد احترام استاد — وہ جن سے مَیں بے حد متأثر ہُوا ہوں۔ اور میرا سر جسے دیکھ کر احتراماً جُھک جاتا ہے)۔ اِدھر اُدھر کی بہت سی باتوں کے بعد وُہ مجھ سے میری اُس نظم کے بارے میں باتیں کرتے رہے جو مَیں نے اُن کے بارے میں کالج کے آخری ایّام میں کہی تھی۔ وُہ کبھی اپنی دھیمی اور کھنک دار آواز میں کبھی انگریزی، کبھی اُردو، کبھی پنجابی اور کبھی ملتانی میں مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ کہنے لگے۔ "مَیں ان ساری تعریفوں کے بھلا کب قابل ہوں۔ جو اس نظم میں تم نے

میرے لئے روا رکھی ہیں۔ ویسے تم نے مجھے سمجھنے کی کوشش ضرور کی ہے۔"

پھر کسی جلسہ سالانہ کی بات ہے۔ میرے ذمہ ملتان اور مظفر گڑھ کے مہمانوں کے قیام و طعام کا بندوبست تھا۔ ایک دن اچانک مجھے پتہ چلا کہ اخوند صاحب میرے مہمانوں کے ساتھ بیرک کے فرش پہ ہی دراز ہیں۔ اور یہیں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ہم سب کے سب بھاگے بھاگے گئے۔ تو دیکھا کہ وہ اپنے سیاہ رنگ کے سوٹ کیس کو تکیہ بنائے پرالی پہ ہی دراز تھے۔ اُن کی گھڑی اُن کے قریب ہی دھری تھی۔ مَیں نے سلام کہا۔ اُٹھ بیٹھے۔ ہم سب سے باتیں کرتے رہے۔ اور اس شام پُرانی یادوں کا سلسلہ پھر تازہ ہوگیا۔ مَیں نے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی، کالج میں کسی مناسب جگہ چلنے کو کہا، مہمانانِ خاص میں جگہ حاصل کرنے کی تجویز پیش کی، لیکن ایک ہی بات کہتے رہے کہ "مسیح موعودؑ کے پیغام کو سُننے آیا ہوں اور اُنہی کے لنگر سے تبرک کھانے کی خواہش ہے۔ اِس راہ میں اگر ننگی زمین پر بھی سونا پڑے گا، تو سوؤں گا۔" چنانچہ اس دَوران جتنے دن بھی وہ وہاں رہے، عام مہمانوں ہی کے درمیان اسی حالت میں قیام کرنا پسند کیا۔ انسان میں کمزوریاں ہوتی ہیں۔ اُن میں بھی کمزوریاں ہونگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُن کی خوبیاں اُن کی کمزوریوں پر چھاگئی تھیں۔

پھر اچانک سُنا کہ وُہ وفات پا چکے ہیں، اُن کے شاگردوں میں سے جس جس نے بھی سُنا۔ دم بخود رہ گیا۔ (خدا جنت الفردوس میں اُنہیں جگہ دے) خود مجھے اسپر یقین نہ آتا تھا۔ اَب بھی یہ حالت ہے کہ شیکسپیئر کا کوئی ڈرامہ ورڈزورتھ یا بائرن کی کوئی نظم سامنے آجاتی ہے تو تعلیم الاسلام کالج بے طرح یاد آنے لگتا ہے۔ پُرانی خوشگوار یادیں، خیال کے اُفق پہ بے پناہ ہجوم کرنے لگتی ہیں۔ اور عالمِ تصور ہی میں یُوں لگتا ہے کہ اخوند صاحب جیسے ابھی سٹاف روم سے اُسی فراٹے کے ساتھ نکلیں گے۔

اُن ہی کے بارے میں کہی ہُوئی اپنی نظم کا آخری شعر بار بار زبان پر آنے لگتا ہے: ؎

عبدالقادر مٹ نہ سکے گا
عبدالقادر یاد رہے گا

مُرسلہ عطاء الرحمٰن پرویز

چند اشعار

(۱) وہ بیٹھے بے نیاز ہیں گو میرے حال سے
مَیں بیٹھا باتیں کرتا ہوں اُن کے خیال سے (آزاد)

(۲) مقامِ عشق خرد کو حاصل نہیں ہوتا
خسِ خرد میں نہ ہو جب تک آتشِ تبریز! (اثر صہبائی)

(۳) بے رُکے جو وُہ اِدھر سے گذر رہے
تیر پہ تیر جگر سے گذر رہے (اشک رامپوری)

(۴) جلتے ہی رہیں شوق سے ہم سوختہ ساماں
پہلو میں بہر رنگ فروزاں ہو مگر آگ (غلام رسول انور)

(۵) گذر جا بن کے سیلِ تُند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہو جا (اقبال)

(۶) زندگی فطرت کے ہاتھوں میں شکستہ ساز ہے
موت کے سُنسان ویرانوں میں اِک آواز ہے (شورش)

(۷) کیا سلیقہ ہے آشنائی کا
آشنا آشنا سے ڈرتے ہیں (عدم)

رشید احمد جاوید۔ سیکنڈ ائیر۔ ڈگری

اَلحُبُّ لِلّٰہِ وَالبُغضُ لِلّٰہِ

راشد نے ایک نہایت ہی پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی تھی۔ مذہبی غیرت اور جوش اُسے والد کی طرف سے ورثہ میں ملا تھا۔ اُسکی سعی و کوشش کا مرکزی نقطہ دفاعِ مذہب تھا اور اُسکی دلچسپیوں کا محور دینیات تھی۔ بیسویں صدی کی جدّت اپنی تمامتر خوشنمائی و کشش کے باوجود اُس پر بے اثر تھی۔ مادیّت کی اقدار سے وہ یکسر بیزار تھا۔ شاید اسی ذہنی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ڈرتا ہوا قدم رکھتا۔ وہ ہر معاملہ میں حزم و احتیاط سے کام لیتا، مبادا وہ اپنے رحیم و کریم اور خالق خدا کی مرضی کے خلاف کچھ کر بیٹھے۔ سن چوّن ۵۴ میں جب اُس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو اُس کا ذہن پوری طرح مذہب کے سانچے میں ڈھل چکا تھا۔ والدین اسکی دینی غیرت اور مذہبی ذوق و شوق سے واقف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح راشد کو جدید شہروں کی مسموم فضا سے بچالیں۔ "وہ مسموم فضا" کے "سانپ" کو بھی مارنا چاہتے تھے مگر اپنی لاٹھی کی سلامتی کے بھی خواہشمند تھے۔ وہ اپنے لختِ جگر کو زمانہ کی عام رَو کے سپرد کرنا ظلمِ عظیم سمجھتے تھے۔ وہ کسی صحت مند فضا کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ "جویندہ یابندہ"۔ ان کی کوششیں پھل لائیں۔ وہ اپنی بے اطمینانی و اضطراب کا علاج ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ اُن کی نظرِ انتخاب پہاڑوں کے درمیان ایک درسگاہ پر پڑی۔ یہ درسگاہ ایک نہایت ہی پُرسکون اور خاموش مقام میں واقع تھی۔ مادیّت کی بادِ سموم اِسکے ماحول سے ناآشنا تھی۔ وہ اِسکے پہاڑوں کے ساتھ ساتھ پرے سے ہٹ کر چلتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا رُوحانی ماحول نہ صرف زندگی بخش تھا بلکہ رُوح پرور بھی۔ خدا اس بستی کے مؤسس کی عمر میں برکت ڈالے جس نے زمانہ کی ضرورت کو عین وقت پر بھانپ لیا اور ایک ایسے کالج کی بنیاد رکھی جس میں سعید رُوحوں کی غذا کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ دُنیوی علوم کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کا قیام اور دینی تعلیم کا انتظام اس درسگاہ کا طرۂ امتیاز تھا۔

* * *

راشد کالج میں داخل ہو گیا۔ اُس نے دیکھا کہ اِس چھوٹی سی بستی میں اس کے نیک جذبات کی آبیاری کے لئے کافی سامان موجود ہے۔ اگر ایک طرف یہ بستی زمانہ کی لعنتوں سے پاک تھی تو دوسری طرف اِس میں "روحانی مائدہ" کا مناسب انتظام موجود تھا۔ راشد اِس ماحول سے بالکل مطمئن تھا۔ لیکن اکیلا وہ اُکتا جاتا۔ وہ کسی ہم عمر دوست کی تلاش میں تھا۔ لیکن وہ اس بات کا قائل تھا کہ دُنیا کا کوئی خطّہ "کالی بھیڑوں" سے خالی نہیں۔ وہ ان "بھیڑوں" کو بھی خدا کی تقدیر کا ایک حصّہ سمجھتا تھا۔ کہیں تو وہ انہیں بطور عذاب کسی قوم میں پیدا کرتا ہے اور کہیں اپنے بندوں کی آزمائش کیلئے ان کو بھیج دیتا ہے تا جو ان کو پہچان لے اور ان سے دُور رہے، اُسے

انعامات سے نوازا جائے۔ راشد ایک نیک، صالح اور پاکباز دوست کی جستجو میں تھا، جو اُس پر بُرا اثر نہ ڈالے۔ وُہ ایک ایسے ہمنشین کی تلاش میں تھا جو اُسکے نیک جذبات کا احترام کرسکے۔ اُسے ایک ایسے رفیقِ مخلص کی ضرورت تھی جو اُسے اُس کی کمزوریوں سے آگاہ کرتا رہے اور امورِ معروفہ کے بجالانے میں اسکی اعانت کرے۔ الغرض وہ ایک صحیح سالم اور بے داغ شخصیت کا متلاشی تھا۔ وہ اکثر اپنی نمازوں میں خدا سے دُعا کیا کرتا کہ اے خدا! تُو مجھے بدوں کی صحبت سے بچا۔ اور اے مسبّب الاسباب! تُو اپنی نصرت میرے شاملِ حال کر، تا میں کسی ایسے ساتھی کے انتخاب میں کامیاب ہوجاؤں، جو مجھے تجھ ایسی [illegible]م اور کریم ہستی سے دُور لیجانے کا باعث نہ بنے۔

✿ ✿ ✿ ✿

اُسی سال نومبر کے اوائل میں راشد نے اپنی رہائش گاہ تبدیل کرلی۔ وُہ بستی کے صدر علاقہ میں منتقل ہوگیا۔ اُس علاقہ میں قصبہ کی سب سے بارونق اور خوبصورت ترین مسجد واقع تھی۔ اس کی دیواریں اور مینار سنگِ مرمر کے بنے ہوئے تھے اور اُس کا فرش سنگِ زمرد سے بنایا گیا تھا۔ اسکی فضا نہایت درجہ فرحت بخش اور کیف آور تھی۔ راشد صبح، شام اور عشاء کی نمازیں زیادہ تر اسی مسجد میں پڑھتا۔ ایک دن وہ صبح کی اذان سے کافی پہلے بیدار ہوگیا۔ اس خلافِ معمول بیداری کو نعمتِ الٰہی خیال کرتے ہوئے اُس نے مسجد کی راہ لی۔ مسجد "ملکی ٹیوبز" (Milky tubes) کی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ راشد نے ایک کونہ میں نماز شروع کی، یہ اُسکی زندگی کی پہلی نمازِ تہجد تھی۔ اُسے نماز میں غیر معمولی سرور حاصل ہو رہا تھا۔ اسی سرور کی حالت میں برقِ رَو کی طرح اُسکے دل میں ایک خیال گذرا۔ اُسے خدا تعالیٰ کا وعدہ یاد آگیا تھا۔ یہ اُسکی نماز کی آخری رکعت تھی۔ ایک طویل قیام کے بعد راشد جب خدائے رحیم کے حضور سجدہ ریز ہوا۔ تو اُس کے جسم کا رُواں رُواں رِقّت سے معمور تھا۔ اُس نے پُورے درد و الحاح سے اپنی "دیرینہ دُعا" مانگنی شروع کی۔ وہ بار بار اللہ تعا کو اپنے وعدہ کا واسطہ دیتا۔ اسی طرح اُس نے دُوسرا سجدہ مکمل کیا۔ اور جب اُس نے اپنی پُرنم آنکھوں کے ساتھ سلام پھیرا تو آنسوؤں سے جھلملاتی ہوئی آنکھوں نے قریب ہی ایک نفسِ انسانی کو دیکھا۔ راشد کا ایک ہم عمر اپنے خالق سے راز و نیاز کی باتوں میں مشغول تھا۔ راشد ایک رِقّت بھری پُرسوز آواز سُن رہا تھا:

"اے میرے قادر و توانا خدا! میں تیرا ایک ضعیف اور کمزور بندہ ہُوں۔ تُو آگاہ ہے کہ میری زندگی تیری حسبِ منشاء نہیں ہے۔ مَیں بھی اپنی غلطیوں اور کمزوریوں اور گناہوں کا معترف ہوں۔ مگر تُو نے ہی تو کہا ہے: "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللهِ" آواز بھرّا جاتی ہے —"اے ستّار! کیا تُو میری کمزوریوں کی پردہ پوشی نہیں کرے گا۔ اے غفّار! کیا تُو میری غلطیوں کو معاف نہیں کرے گا — اے خدا! — اے رحیم خدا! — اے الٰہ العالمین! تُو مجھے اپنی آغوشِ رحمت میں لے لے۔ میرے دل پر سکینت نازل فرما۔ میرے قلب کو ایقان اور ایمان کی دولت سے مالا مال کر، تا تیری رضاجوئی آسان ہو۔ اَللّٰھُمَّ اٰمِین، آمین یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْن!"

راشد دیر تک اس مضطرب اور بلبلاتی ہوئی روح کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنی نماز ختم کرلی۔ راشد

اپنے سامنے ایک باوقار، متین، وجیہ اور خوش شکل نوجوان دیکھ رہا تھا۔ وہ اس نظریہ سے اتفاق کرنے پر مجبور ہو گیا کہ اُس شخص سے بڑھ کر اور کوئی خوش نصیب نہیں ہو سکتا جسکو قدرت کے ہاتھوں نے خوش شکل بنایا اور اسکے ساتھ ساتھ خوب سیرتی اور اعلیٰ اخلاق سے بھی آراستہ کیا۔ اُسے یقین ہو گیا کہ خدا تعالےٰ نے اسکی دُعا قبول کر لی ہے اور وہ یقیناً اس نیک فطرت اور سعید رُوح نوجوان سے اپنے تعلّقات تودّد و محبّت استوار کریگا۔

* * *

جوں جوں راشد فاخر کے زیادہ قریب ہوتا گیا اُس نے اُسے اپنی طبیعت کے عین موافق پایا۔ وفا، حسنِ عہد، امانت، دیانت، وقار، عفّت، خوش خلقی، خدا خوفی اور صدق میں فاخر یقیناً فخر کا مقام رکھتا تھا۔ راشد کو اسکی یہ خوبیاں بہت ہی پسند تھیں۔ دونوں کے باہمی تعلّقات بڑھتے اور مضبوط ہوتے گئے۔ وہ پانچوں نمازیں اکٹھے ادا کرتے۔ اگر کوئی مذہبی جلسہ ہوتا تو اکٹھے سُننے جاتے۔ اگر کسی بزرگ سے مُلاقات کا پروگرام ہوتا تو اکٹھے جاتے۔ اگر کہیں سیر کا پروگرام بنتا تو دونوں شریک ہوتے۔ کالج جانا اور آنا بھی اکٹھا ہوتا۔ کرکٹ اُن کا محبوب کھیل تھا۔ دونوں بہت اچھی بیٹنگ کرتے تھے۔ اپنی ٹیم کی طرف سے کھیل کا افتتاح فاخر اور راشد ہی کیا کرتے۔ غرض جہاں بھی اکٹھے ہو سکتے تھے ہوتے۔ دونوں ایک دُوسرے کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھاتے۔ تہجّد کی نماز کیلئے ایک دُوسرے کو اُٹھاتے۔ اگر راشد پہلے بیدار ہو جاتا تو وہ فاخر کو اُٹھانے جاتا اور اگر فاخر پہلے جاگ اُٹھتا تو وہ راشد کا دروازہ جا کر کھٹکھٹاتا۔ وہ اکٹھے باجماعت تہجّد ادا کیا کرتے۔ دن کا اکثر حصّہ اکٹھے پڑھتے لکھتے۔ کبھی کبھی مذہبی اُمور کے متعلق باہم دلچسپ گفتگو بھی ہو جایا کرتی، جو بعض اوقات اچھی خاصی بحث کا رنگ اختیار کر لیتی۔ بالآخر ایک اُن میں سے دُوسرے کی بات مان لیتا۔ وہ ایک دُوسرے کو تحفے بھی دیا کرتے۔ کبھی کبھار دعوت بھی ہو جاتی۔ اِس طرح وُہ بہت ہی مسرور اوقات بسر کرنے لگے۔ نیکی میں مسابقت ہمیشہ دونوں کے پیشِ نظر رہتی۔ اُن کے اکثر اکٹھا رہنے کے باعث ناقدین نے ان کے تجزیئے کرنے شروع کر دیئے۔ بعض ایک کو دُوسرے کا "ضمیمہ" کہتے تو بعض "تتمّہ" خیال کرتے۔ بعض ان کو "رَفیق عَلیٰ شَبِیۡہِ رفیق" کہتے۔ وہ یہ تبصرے سُن کر دِل ہی دِل میں بہت خوش ہوتے۔ وُہ اِس بات کو فضلِ الٰہی سے تعبیر کرتے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انکے افعال و اقوال کے علاوہ اُن کی جسمانی ہیئت میں بھی مشابہت رکھدی ہے۔ اُن کے تعلّقات مومنانہ اخوت کی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتے گئے۔ ایک دُوسرے کی تکلیف کو اِس طرح محسوس کرتا گویا اُس کی اپنی تکلیف ہے۔ ایک کی ضرورت دُوسرا اپنی ضرورت سمجھتا۔ موسم گرما کی تعطیلات میں جب راشد اپنے وطن جاتا تو دونوں شدید ذہنی تکلیف محسوس کرتے۔ چند ماہ کی فرقت ان کے لئے دوبھر ہو جاتی۔ ان کا تو یہ حال ہوتا تھا کہ اگر ایک دُوسرے کو گھر چھوڑنے جاتا تو دُوسرا کہتا کہ اب میں آپ کو چھوڑ کر آؤں گا۔ اِس طرح نہ معلوم انہوں نے باہمی محبّت اور اخوت کے کتنے ہی مظاہرے کیئے۔ راشد اور فاخر چیزوں کے ہمیشہ اچھے پہلو لیا کرتے تھے۔ تعطیلات کو بھی وُہ اپنے تعلّقات کی مضبوطی کے لئے ایک اچھا شگون خیال کرتے۔ ان ایام میں اُن کی باہمی خط و کتابت ہُوا کرتی۔ جس میں وہ بتاتے کہ جب وہ علیحدہ ہوئے تو انہوں نے

اِس جُدائی کو کیا کچھ محسوس کیا۔ اور کیونکر فرقت کے ایّام میں وہ روز ہی ایک دُوسرے کو خواب میں دیکھا کرتے۔ یہ عارضی جُدائی کبھی بھی ان میں بُعد پیدا کرنے کا باعث نہ بنتی بلکہ تعطیلات کے اختتام پر جب وہ ملتے تو اپنے آپ کو اور بھی زیادہ قریب پاتے۔

❖ ❖ ❖

راشد اور فاخر کی دوستی پروان چڑھتی رہی۔ وُہ ایک دُوسرے کے خیالات اور نظریات کے بخوبی واقف ہو چکے تھے۔ وہ ہمیشہ ایک دُوسرے کی رائے کا احترام کرتے۔ اپنی دوستی کے متعلق اُن کا یہ نظریہ تھا کہ زمانہ اسکی مضبوطی میں مخل نہیں ہو سکے گا۔ مگر دفعۃً حالات نے پلٹا کھایا۔ چند "کالی بھیڑیں" فاخر کو اپنے حلقۂ اثر میں لینے میں کامیاب ہوگئیں۔ فاخر دن بدن بدلتا گیا۔ اسکی تمام زندگی میں انقلاب آگیا۔ دُعاؤں میں شغف کمزور پڑنے لگا۔ تعلیمی فرائض سے کوتاہی اُس کا معمول بنتی گئی۔ آوارگی اسکے روزانہ پروگرام کا ایک اہم جُز ہونے لگی۔ فرمانبردار فاخر والدین کے لئے گستاخ بیٹا ثابت ہوا۔ اوباش لڑکوں کی صحبت رنگ لائی۔ نماز کے اوقات قہوہ خانوں میں صرف ہونے لگے۔ محفل جمتی چائے کا دَور چلتا۔ گپیں ہانکی جاتیں مگر حقوق اللہ کو نظر انداز کر دیا جاتا۔ اگر کبھی بھولے سے مسجد میں آنا ہو جاتا، تو لمبی لمبی اور پُرسوز نمازیں پڑھنے والا فاخر چند منٹوں میں نماز ختم کر کے رفو چکر ہو جاتا۔ خشوع و خضوع تو درکنار یہاں تو خوفِ خدا بھی رخصت ہو چکا تھا۔ جب لوگ باطمینان نماز پڑھ رہے ہوتے تو فاخر کے نام نہاد دوست اُسکو کہنیاں مار مار کر ہنسانے کی کوشش میں ہوتے۔ آوارگی کا یہ عالم تھا کہ نصف شب تک گھر والوں کو علم نہ ہوتا تھا کہ فاخر کہاں ہے۔ اگرچہ فاخر کے دِل میں کبھی کبھی اِن باتوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی تاہم وُہ اب بھی راشد کی رائے کا احترام کرتا مگر صرف قال سے۔ وُہ راشد کے سامنے آتا تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا۔ باحترام السلام علیکم کہتا۔ خیریت پُوچھتا اور پھر ندامت کا مارا چُپ ہو جاتا۔ "کالی بھیڑیں" فاخر کا دامن نہ ہی چھوڑتیں۔ اگر راشد کبھی گفتگو لمبی کرنا چاہتا تو فاخر کو مجبور کر دیا جاتا کہ وُہ اُن کے ساتھ چلے۔ رچھو، رحمو اور باکا اُس کی زندگی تباہ کرنے پر تُل چکے تھے۔ اَب وُہ کھلم کھلا راشد اور فاخر کے تعلقات کو ہدفِ طعن بنانے لگے۔ وُہ فاخر کے سامنے راشد کو عجیب عجیب بُرے ناموں سے پکارتے۔ ہر ممکن طریق سے اُسکا مذاق اُڑاتے مگر فاخر نے اُن کو کبھی ایسا کرنے سے نہ ٹوکا۔ فاخر کی قوّتِ ارادی ختم ہو چکی تھی۔ وُہ رچھو، رحمو اور باکے کا غلام بن کر رہ گیا تھا۔ اُن کا ارادہ اس کا ارادہ بن گیا۔ اور اُن کی رائے اس کی رائے۔ غرض وُہ تو اپنا سب کچھ ان کے حوالہ کر چکا تھا۔

❖ ❖ ❖

راشد اپنے دوستوں کے متعلق دو باتیں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اوّل یہ کہ وُہ بے نماز ہوں۔ دوم یہ کہ وُہ اپنے فرائض سے کوتاہی کریں اور آوارگی کو اپنائیں۔ راشد نے دیکھا کہ فاخر میں یہ دونوں بُرائیاں سرایت کر چکی ہیں۔ نماز کے وقت جب راشد دیکھتا کہ فاخر مسجد میں نہیں آیا، تو اُسکا دِل چھلنی چھلنی ہو جاتا۔ جب وُہ اُسکی آوارگی اور تعلیمی فرائض سے بے اعتنائی پہ نظر دوڑاتا، تو اُس کے

سینہ میں ٹیسیں اُٹھنے لگتیں۔ اُس کا دِل جل اُٹھتا۔ وُہ تڑپ تڑپ کر رہ جاتا، مگر وُہ کیا کرسکتا تھا۔ فاخر اپنے معاملات کا مختار تھا راشد کے لئے صرف یہی تھا کہ وُہ کڑھے اور جلے۔ اور اُس کے حق میں کلماتِ دُعائیہ کہہ چھوڑا کرے۔ ایک دن راشد نے اُسے اپنے ہاں بُلایا۔ ایک پُر تکلّف دعوت کا اہتمام کیا۔ کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ اُس نے فاخر کی اصلاح کے لئے ہر مؤثر کلمہ استعمال کیا۔ ہر مناسب طریق سے تحریص و تحریض دلائی۔ مگر دِل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اِن باتوں اور درد ، اور قلق میں ڈوبی ہوئی اِن داستانوں کیلئے فاخر کے دِل میں اب کوئی جگہ نہ تھی۔ فاخر کی مثال تو اُس ریگستان کی طرح تھی کہ جس پر سیاہ بادلوں کی گھٹائیں آئیں مگر وُہ اُن سے بارش کے قطرات حاصل نہ کرسکا ہو۔

راشد اب ایک نئے مسئلے سے دوچار تھا۔ کیا اُسے فاخر سے اپنے تعلّقات جاری رکھنے چاہئیں یا نہیں؟ کافی دِنوں کے تردّد اور سوچ بچار کے بعد راشد کے ضمیر نے یہ فیصلہ کیا کہ فاخر سے مزید تعلّقات رکھنا خطرہ سے خالی نہیں۔ جب تک وہ بد رفیقوں کو نہیں چھوڑتا، اُس سے کنارہ کشی کرلی جائے۔ اِس فیصلہ کے بعد اُس نے فاخر کے نام مندرجہ ذیل تحریر لکھی :۔

" صدر ۔ مکان نمبر ۲

۲۳ر دسمبر ۱۹۵۷ء

برادرِ عزیز !

السّلامُ علیکُم : آج حالات نے مجھے ایک ایسی تحریر لکھنے پر مجبور کیا ہے جس کو لکھتے ہُوئے مَیں اپنے دِل میں شدید تکلیف اور کرب محسوس کر رہا ہوں۔ فَھُوَ ھٰذَا !

اپنی جان پر رحم کرتے ہُوئے رجّھو، رحمو اور باکے سے اپنے تعلّقات قطع کرلو۔ مَیں اُس وقت تک آپ کا دوست تھا جب تک آپ کے اور میرے تعلّقات لِلّٰہ تھے۔ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو " الوداعی ، سلام" قبول کرو۔ مَیں آپ سے سیر ہوگیا۔ دیکھو، تم فرشتہ تھے، ان لوگوں نے تمھیں ذلیل کر دیا۔ تم شریف تھے، اِن لوگوں نے تمھیں شریر بنادیا۔ تم فرمانبردار تھے مگر انھوں نے تمھیں گستاخی اور بے باکی سکھائی۔ تم ہی بتاؤ، اِن لوگوں نے تمھیں کونسی اچھی بات بتائی۔ . . . . سُنو! مَیں لِلّٰہ تمہارے ساتھ مُحبّت رکھتا تھا، اب مَیں لِلّٰہ تمہارے ساتھ بُغض رکھوں گا۔ خدا کے دُشمن سے مَیں کیونکر دوستی لگا سکتا ہوں۔ لیکن فاخر! مت بھولو کہ خُدا سے بُغض تمھیں کچھ فائدہ نہ دے سکے گا۔ ڈرو اور خدا کی غیرت کو نہ آزماؤ۔ اُس کے قہر سے پناہ چاہو۔ نفس کی فریبی چھوڑ دو۔ صدق کے ساتھ خدا کی راہ پر قدم مارو۔ تا تمھیں ہمیشہ کی زندگی بخشی جائے۔

تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔ جواب نہ آیا تو سمجھ لوں گا کہ میری باتیں تمھیں مرغوب نہیں، بلکہ رجّھو، رحمو اور باکا ہی تمہاری مراد ہیں۔ . . . خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔

تمہارا ـــــــــ

راشد ! "

جب راشد یہ خط لکھ چکا، تو اُس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وُہ فاخر کی قسمت پر رو رہا تھا۔ راشد نے چند روز جواب کا انتظار کیا۔ مگر فاخر کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ راشد نے فاخر سے ملنا جُلنا ترک کردیا

یہاں تک کہ جس راستہ سے فاخر آرہا ہوتا، وہ اُس راستے سے اعراض کرجاتا۔ اگر کبھی اچانک سامنا ہوجاتا، تو وہ متانت اور وقار کے ساتھ یہ شعر زیرِلب گنگناتا ہوا پاس سے گذر جاتا ؎

اَب عطر بھی ملو تو محبت کی بُو نہیں
وُہ دِن گئے تمھارا پسینہ گلاب تھا

❖ ❖ ❖

راشد نے اعزاز کے ساتھ بی۔اے پاس کرلیا۔ مگر فاخر کی آوارگی آڑے آئی۔ وُہ تیرھویں جماعت سے آگے نہ نکل سکا۔ دو سال بعد راشد کی شادی ہوگئی۔ اِسی دوران اُسنے اپنے آپکو خدمتِ دین کیلئے پیش کردیا۔ چنانچہ اُسے بیرونِ ملک مبلّغ بناکر بھیج دیا گیا۔ اسکا تبلیغی مرکز ایک بہت ہی خوبصورت شہر میں تھا۔ کئی سعید رُوحیں اُسکے ذریعہ مُشرّف باسلام ہوئیں۔ اُس نے اپنے مرکز میں ایک عظیم الشّان مسجد تعمیر کرائی۔ ابھی اُسے وہاں آئے سال ہی گذرا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسکو ایک ننھّا منّا چاند سا بچّہ بھی عطا فرمادیا۔ راشد اپنے گھر میں بالکل خوش تھا۔ مگر اَب بھی فاخر اُسے نہیں بھولا تھا۔ دراصل اُسکی بچپن کی نیک فطرت اُسپر بہت اثرانداز تھی۔ اُسے یقین تھا کہ اُسکی نیک فطرت ضرور کسی نہ کسی دن اُسکو اپنی اصلاح پر مجبور کردے گی۔ وُہ اپنی شبانہ روز دُعاؤں میں ہمیشہ اُسے یاد رکھتا۔ اُسکی ہمدردیاں اب بھی فاخر کے ساتھ تھیں مگر اَب وُہ اُسکے لئے صرف دُعا ہی کرسکتا تھا۔ سو یہ ہتھیار اُس نے حتی المقدور استعمال کیا۔ اُسکا دِل اِس بات کا بہت ہی مشتاق تھا کہ خُدا اُسے کوئی معجزہ دِکھائے۔ وُہ ایک مُردہ کیلئے زندگی کا متمنّی تھا۔ اپنے بچپن کے رفیق مخلص فاخر کی زندگی کا۔

نومبر ۱۹۶۱ء کی ایک صبح جب وُہ مسجد میں فجر کی نماز پڑھنے کیلئے داخل ہوُا، تو اُس نے دیکھا کہ مسجد کے دائیں طرف شمالی کونہ میں ایک شخص نہایت درد اور الحاح کے ساتھ دُعائیں مانگ رہا ہے۔ یہ ایک غیرمانوس اور اوپری آواز معلوم ہوتی تھی۔ نماز سے فراغت کے بعد راشد اِس نئے آنے والے کی طرف بڑھا۔ اور کہا:۔

"آپ کی تعریف!"

"مجھے فاخر کہتے ہیں اور مَیں "پاکستان" سے آج ہی آیا ہوں۔ مَیں مَوت چاہتا ہوں کیونکہ مَیں اپنی زندگی سے مایوس ہوچکا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ یہ موت کسی ایسی جگہ آئے جہاں مجھے کوئی نہ جانتا ہو۔ اِسی لئے مَیں نے اِس مُلک کا رُخ کیا ہے۔"

وُہ دونوں ایک دُوسرے کو نہ پہچان سکے۔ راشد جو چہرہ اپنے سامنے دیکھ رہا تھا، وُہ بالکل تبدیل ہوچکا تھا، اُسکا نُور سیاہیوں میں تبدیل ہوچکا تھا۔ اُسکی سیاہ موٹی آنکھیں پیلی پڑچکی تھیں اور اندر کو دھنس گئی تھیں۔

"اچھا! تو آپ کو فاخر کہتے ہیں۔ کیا آپنے مجھے پہچانا ہے؟"

"نہیں" اجنبی نے کہا۔ "مَیں راشد ہوں"

جب فاخر نے راشد کا نام سُنا، تو اُسکی بے اختیار چیخ نکل گئی۔ دونوں کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ اور وُہ گلے مِل گئے۔ فاخر بار بار کہتا:۔

"راشد بھائی! مجھے معاف کردو۔ مجھے معاف کردو۔ میری بے وفائی سے درگذر کرو۔ مَیں نے اپنی جان پر بہت ظلم کئے۔ مجھ پر احسان کی نظر کرو۔ دُعا کرو۔ تا ہمارا رحیم خدا، مجھے نئی زندگی بخشے۔ راشد! خدا کیلئے مجھے معاف کردو! اور اللہ تعالیٰ عفوٗ کریم سے معافی دِلانے میں میرے ممد و معاون اور نصیر و ناصر بنو۔" (۷ر دسمبر ۱۹۶۱ء)

آپکے خطوط

مکرمی جناب مدیر اعلیٰ صاحب "المنار"

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

مجھے "المنار" کا موجودہ شیوع پڑھکر انتہائی خوشی ہوئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! کہ اُن تمام اُمور کی جن کی طرف میں نے توجہ دلائی تھی، اِصلاح ہوگئی ہے۔ آپکا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے اُمّید ہے۔ آئندہ بھی اِس میں ایسے ہی اعلیٰ پایہ کے مضامین اور نظمیں شائع ہونگی۔ جو علمی، اخلاقی اور رُوحانی اقدار کی حامل ہوں۔ ورنہ اگر یہ رُوح نہ ہو تو اِن کی حیثیت دِماغی تعیّش کے سامان سے زیادہ نہیں ہوتی جو عموماً گمراہی کا موجب ہوتا ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنے لازوال لٹریچر میں اِس بارہ میں ہمارے لئے ایک قابلِ تقلید مثال چھوڑی ہے۔ پس ازبس ضروری ہے کہ ہم اِس سے سرِمُو انحراف نہ کریں۔ اَور ایسے لٹریچر کو ترک کردیں، جو راستی اور رضاءِ الٰہی کا موجب نہیں۔ جیسا کہ حضورؑ کا فرمان ہے۔ ع

"چھوڑ دو وُہ راگ جس کو آسمان گاتا نہیں"

وَالسَّلَام

خاکسار۔ (ڈاکٹر) محمد رمضان ریٹائرڈ

محلّہ دارالصدر غربی

ربوہ

مکرم مدیر اعلیٰ صاحب "المنار"

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

انگریزی والے کہتے ہیں پہلا تأثر صحیح اور مستقل ہوتا ہے۔ یا پھر ؎ "نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی" والی بات تھی۔ مجھے جس روز "المنار" ملا۔ بلکہ جس وقت۔ اُسی وقت "اداریہ" دیکھتے ہی مجھے آپکا رسالہ پسند آگیا اور مَیں نے اسے اوّل سے آخر تک ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ بالعموم کالجوں کے اُردو رسالوں میں کالج کی زندگی اور اسکے مسائل کے متعلق بہت کم لکھا جاتا ہے۔ اور بہت حد تک کالج کی فضا اور اسکے ماحول پر تبصرہ کرنا کالج کے انگریزی حصّہ سے مختص ہوتا ہے۔ یہ چیز مجھے نہیں بھاتی۔ انگریزی ہم مجبوراً بولتے اور لکھتے ہیں۔ ہماری قومی زبان تو اُردو ہے۔ جس میں ہم بے تکلّف اپنے خیالات کو تحریر کا جامہ پہنا لیتے ہیں۔ اور اسی کو ہم انگریزی کی نسبت زیادہ آسانی سے پڑھ لِکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ اِس لئے شاید بلکہ غالباً اِسی وجہ سے آپکے رسالہ کے متعلق میرا تأثر شروع سے ہی بہت اچھا پڑ گیا۔ اور جُوں جُوں مَیں اِسکے صفحات اُلٹتا اور پڑھتا گیا۔ مضامین کا تنوّع، علم، ادب اور مذہب کا امتزاج مجھے بھاتا گیا۔ درحقیقت یہ ہمارے کالج کا ہی امتیاز ہے۔ کہ اِس میں "دُنیاوی" مضامین کے ساتھ دینی اور تربیتی مسائل کو بھی سمویا جاتا ہے۔ اور یہ حقیقت کالج کے قیام کے مقصد اَور اسکے حصُول کی کوشش کی آئینہ دار ہے۔ ٹھوس علمی مضامین

نیز مزاحیہ لیکن پسندیدہ طرزِ نگارش آپکے رسالہ کو یقیناً محبوب اور مقبول بناتا ہے، اور اسکے ساتھ اس خدمت کے صلہ میں آپ کو نیکی اور سعادت کا حقدار بھی۔ جو آپ اس الحاد کے زمانہ میں اپنے ہمجولیوں کی جماعتی اور اسلامی رنگ میں تربیت دینے کی بجالا رہے ہیں۔ مقالہ جات کا ادبی معیار خاصا بلند اور مضامین کا انتخاب پسندیدہ ہے۔ بالخصوص حصہ نظم میں اپنے علم دوست پروفیسروں کے علاوہ "بیرونی" مشاہیر کے کلام کا مجموعہ اس کی ادبی حیثیت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔ "ترتیب" کو دیکھ کر آپکی محنت کی داد نہ دینا زیادتی ہے۔

(خاکسار محمد ابراہیم۔ ہیڈ ماسٹر)

مکرمی مدیر صاحب "المنار"

اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ۔

رسالہ کی تدوین و ترتیب میں سب سے مشکل کام اداریہ کا تحریر کرنا ہوتا ہے۔ اور جو رسالہ بھی اپنے اس فرض کو خوش اسلوبی و عمدگی سے نباہ لیگا۔ وہ اس امر پر یقیناً دلالت کریگا کہ اُسکے مرتب کنندگان نہایت اعلیٰ قابلیت کے مالک اور انتظامی ملکہ سے حظِ وافر رکھتے ہیں۔ اِس وقت میرے مدِ نظر رسالہ "المنار" مرتبہ ماہ اکتوبر ہے۔ اسمیں "اداریہ" کے کالم کو عمدگی سے تحریر کیا گیا ہے۔

پھر مضامین کے لحاظ سے بھی رسالہ کی وقعت دیکھی جاتی ہے۔ اسمیں بھی یہ رسالہ اوّل نمبر پر نظر آرہا ہے۔ مثلاً اسمیں ایک مضمون "جوہری توانائی" درج ہے، جو کہ اُردو اکیڈیمی میں تیسرے نمبر پر رہ کر اپنی داد حاصل کر چکا ہے اور اب اس پر مزید لکھنا محض لاحاصل ہو۔ اسکے علاوہ "الیکشن" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا گیا ہے جو کہ نہایت ہی بصیرت افروز اور نصیحت آموز بھی ہے۔ اسمیں "الیکشن" کے اُن گھناؤنے اور بھیانک مناظر کو دکھایا گیا ہے جو کہ اسمیں حصّہ لینے والے کو اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ اور ان مناظر کے بعد کوئی عقلمند انسان اِس قسم کے الیکشن میں حصّہ لینے کے لئے تیار نہ ہوگا۔ اور طلبہ میں یہی جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا جسمیں یہ رسالہ فائز المرام ہے۔ یہ رسالہ صرف دُنیاوی مضامین پر ہی مشتمل نہیں بلکہ اسمیں ایسے مضامین بھی درج ہیں جن کا تعلق دینیات و تصوّف سے ہے۔ مثلاً "ایک دلچسپ مکالمہ" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا گیا ہے۔ اسمیں معترض نے جس فلسفیانہ رنگ میں پانچ نمازوں کے ادا کرنے والوں کا خاکہ اُڑانا چاہا ہے، اُس کا جواب سرسری طور پر مشکل بلکہ ناممکن نظر آتا ہے مگر جو اہلِ حال لوگ ہوتے ہیں یا معرفتِ الٰہی کی روشنی سے حظّ وافر رکھتے ہیں، اُنکے سامنے ایسے اعتراضات کی کیا حقیقت ہے۔ چنانچہ جب معترض صاحب کو پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب نے اِس کا جواب تصوّفانہ رنگ میں دیا۔ تو معترض صاحب کا اعتراض صوف ہو کر رہ گیا۔ اور بغیر خاموشی یا تسلیم کرنے کے اُس سے کچھ نہ بن پڑا۔ تو یہ محض اللہ تعالےٰ کا فضل ہے۔ جو کہ

"تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

کا مصداق ہے۔

بہر حال یہ رسالہ اپنی عمدگی، خوبی اور صفائی کے لحاظ سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس کے کارکنان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اِس کو مزید ترقی دے سکیں۔

خاکسار (چوہدری) نور احمد سپرنٹنڈنٹ خزانہ۔ ریوہ

آفتاب احمد

مباحثہ

یُوں تو آپ نے بھی بہت سے مباحثے سُنے ہو نگے، لیکن ہم نے خوش قسمتی سمجھئے یا بدقسمتی سے سُننے کی بجائے مباحثہ کو دیکھا ہے۔ قصّہ یُوں ہے کہ ایک روز ہمیں خیال آیا کہ چلو آج نوٹس پڑھ کر کالج کے نوٹس بورڈ پر ہی احسان کر ڈالیں۔ چنانچہ بڑے طمطراق سے اپنے ساتھیوں کو ساتھ لیکر نوٹس بورڈ کی طرف کوچ کیا۔ نوٹس بورڈ نے بھی شایانِ شان استقبال کیا۔ اور ایک عدد انٹر کالجیئیٹ مباحثہ کا مژدہ سُنایا۔ اِس اعلان کے سُنتے ہی ہماری باچھیں کھِل گئیں۔ اہ رغیر حاضری کے جُرمانوں کی لسٹ کو بھی خاطر میں نہ لاتے ہوئے مباحثہ کی خوشی میں اپنے کپڑوں میں بڑی مشکل سے سما رہے تھے۔ لیکن چند ہی لمحے بعد ہمارے مُنہ اِس طرح لٹک گئے جس طرح درخت کے ساتھ آم لٹک رہے ہوتے ہیں۔ ہُوا یُوں کہ مباحثے کا پروگرام شام کو چھ بجے شروع ہونا تھا۔ چونکہ ہمارے گھر کالج سے چھ میل کے فاصلے پر تھے۔ اِس لئے سردی کے موسم میں شام کو ۶ میل آنا کوہ قاف کی گھاٹیوں سے شہزادی کو دیو کے پنجے سے چھڑانے سے کم نہیں تھا۔ اَب جو آنے کے متعلق بحث شروع ہوئی، تو ایک اچھا خاصہ مباحثہ ہی بن گیا۔ آخر جمہوریت کے قاعدہ نمبر ا کی رُو (الف) کو بروئے کار لایا گیا یعنی ووٹنگ کرائی گئی۔ فیصلہ یہ ہُوا کہ رات کو مباحثہ ضرور سُنا جائے اور سائیکلوں کی بجائے ٹانگے پر آیا جائے۔ چنانچہ باقی خوشی میں باقی پیریڈوں سے فرار اختیار کر کے گھر روانہ ہو گئے۔ راستے میں ٹانگے والے سے بات طے کر کے گھر پہنچ کر تیاری شروع کر دی۔ کہیں بوٹوں پر پالش ہو رہی ہے تو کہیں دھوبی سے پچھلے ہفتے کے کپڑے منگوائے جا رہے ہیں۔ کہیں خانساماں کو وقت سے پیشتر کھانا تیار کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے تو کہیں ٹوٹے ہوئے بٹنوں کو دوبارہ لگایا جا رہا ہے۔

بڑی مشکل سے عین وقت پر تیار ہو کر مقررہ جگہ پر پہنچنے کے لئے گھر سے روانہ ہُوئے تو خیال آیا۔ کہ کیوں نہ باقی ساتھیوں کو بھی ساتھ لیتے چلیں۔ چنانچہ حنیف کو جا کر آواز دی تو معلوم ہُوا کہ وُہ مہمانوں کو چھوڑنے سٹیشن پر گیا ہے۔ اِس خیال سے کہ کہیں دیر نہ ہو جائے، جلدی جلدی قدم اُٹھانے لگا۔ تھوڑی دُور پر ظفر مل گیا۔ اُس کو ساتھ لے کر روانہ ہُوئے۔ تو راستے میں انجم بھی مِل گیا۔ تینوں تیزی سے چل کر مقررہ جگہ پر پہنچے تو معلوم ہُوا کہ ابھی تک وہاں کوئی بھی نہیں پہنچا۔ چنانچہ اَب باقی ساتھیوں کا اِنتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد انور اور احمد بھی آ گئے۔ اور اَب ٹانگہ پر بیٹھ کر روانہ ہُوئے۔

راستے میں شرارتیں کرتے ہُوئے اور گپیں ہانکتے ہُوئے آخر کالج کے قریب جا کر تانگہ رُکوایا اور بڑی شان کے ساتھ کالج کے ہال کی طرف بڑھے اور اُونٹ کی طرح گردنیں اُٹھائے اندر داخل ہونے ہی والے

تھے کہ عین دروازے سے دو قدم باہر ہی ہالٹ کرنا پڑا۔ عینک کو سرکا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دروازے پر بلّا وغیرہ لگائے ہوئے کسی ایک صاحب نے ہمیں روکنے کی جرأت کی تھی۔ جی میں آیا کہ کیوں نہ اسے دھکّا دے کر گرا دیا جائے۔ لیکن جب اُس کا گوشت سے آزاد جسم نظر آیا تو جی میں رحم آگیا۔ اپنے روکے جانے کی گستاخی کی وجہ پوچھی تو اُس نے پروفیسر انچارج کی طرف اشارہ کر دیا۔ اور کہا کہ مباحثہ کب کا شروع ہو چکا ہے۔ آپ دیر سے تشریف لائے ہیں، اَب کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہمنے اپنی سینارٹی (Seniority) جتلائی اور پروفیسر صاحب کو ایک لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد رام کر ہی لیا۔ اور اُنہوں نے ہمیں بڑی آہستگی کے ساتھ اندر داخل ہونے کی اجازت دے دی۔

آہستہ سے اندر جاکر سب سے آخر میں بیٹھ گئے۔ لیکن لاؤڈ سپیکر کی آواز صاف نہ تھی۔ اِس لئے ہم اُٹھ کر آگے چلے گئے۔ اُٹھتے وقت کرسیوں کی آواز نے سارے ہال کو ہماری طرف متوجّہ کر دیا۔ اور سب لوگ مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ پروفیسر صاحب بھی قہر آلودہ نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے اور ہم بھیگی بلّی کی طرح خاموشی سے کرسیوں پر دبکے بیٹھے تھے۔ مباحثہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور قائدِ ایوان قرارداد کو ایوان میں پیش کر رہے تھے۔ جب ذرا اطمینان سے بیٹھ گئے۔ تو انجم صاحب نے اشارہ سے سٹیوڈ کو بُلایا اور اُسے کہنے لگے کہ پانی پلاؤ۔ ہم ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے اور سٹیوڈ بیچارہ بھی شرمندہ ہو رہا تھا۔ اب جو تقریر کی طرف متوجّہ ہوئے تو سارا ہال مقرر کی داد تالیاں بجا کر دے رہا تھا۔ چنانچہ ہم نے بھی تالیاں بجائیں۔ جب تالیاں ختم ہو گئیں اور مقرر دوبارہ تقریر شروع کرنے لگا۔ تو انجم صاحب نے زور زور سے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ سب لوگ پھر مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے، اور ہم سر نیچے کئے ہنسی کو دبانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایوان میں سنّاٹا طاری تھا۔ اور اَب قائدِ حزبِ اختلاف اپنے دلائل کی بوچھاڑ شروع کر چکے تھے۔ تقریر کے دوران میں وہ چند منٹ کے لئے ایک جگہ رُکے، تو انجم صاحب نے زور زور سے دو تین چھینکیں مار ڈالیں۔ اَب تو سارے لوگ پیچھے مُڑ مُڑ کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ اور پروفیسر صاحب سے بھی نہ رہا گیا۔ لوگوں کی نظریں پھرتے ہی وہ بھاگتے ہوئے آئے اور ہم سب کو ہال سے باہر تشریف لے جانے کیلئے کہا۔ ہم خاموشی سے باہر چلے گئے۔

باہر نکل کر ٹانگے والے کو واپس چلنے کے لئے کہا۔ تو وہ بڑی حیرانگی سے پوچھنے لگا۔

"بابو جی! اِتنی جلدی تقریریں ختم ہو گئیں؟ ابھی تو مَیں گھوڑا کھول کر بیٹھا بھی نہیں تھا۔"

اور ہم سب دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہے تھے۔

یہ تھا مباحثہ جو ہم نے دیکھا۔

ہمارے سالانہ مباحثے

تین اور چار فروری کو کالج یونین کے زیر اہتمام ہمارے کالج کے آٹھویں آل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی اور اردو مباحثے اپنی روائتی شان کے ساتھ منعقد ہوئے۔ ان دنوں کالج کے حلقوں میں خوب چہل پہل اور رونق رہی۔ ان مباحثات میں مغربی پاکستان کے متعدد کالجوں نے اپنے نمائندے بھجوائے۔

انگریزی مباحثہ:

یہ مباحثہ ۳ر فروری کو سات بجے شام کالج ہال میں شروع ہوا۔ مباحثہ کی صدارت کے فرائض فضل احمدؐ سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ کالج یونین نے ادا کئے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد صاحب صدر نے کالج کے مقرر سید مشہود احمد شاہ کو قائد ایوان کی حیثیت سے قرارداد پیش کرنے کے لئے بلایا۔ قرارداد زیر بحث یہ تھی "Men are ruled by Women" آپ نے قرارداد کے حق میں متعدد دلائل دیئے۔ اور ایوان سے پرزور الفاظ میں اپیل کی کہ وہ آج کی قرارداد کو منظور کرلیں۔ اس کے بعد نور محمد چانڈیو حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے قرارداد پر بحث کرنے کیلئے آئے۔ آپ نے کئی دلائل دیتے ہوئے کہا کہ عورتیں مردوں کی حکمران نہیں بن سکتیں۔ بعد ازاں دوسرے کالجوں کے مہمان مقررین نے تقاریر کیں۔ قائد ایوان اور ان کے ساتھی اس بات پر مصر تھے کہ عورتیں مردوں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ حکمرانی کی مختلف توجیہیں پیش کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ عورت مرد کے جذبات اور احساسات پر حکمرانی کرتی ہے۔

حزب مخالف کے مقررین کا یہ موقف تھا کہ عورت کا کردار اضافی ہے۔ علوم جدیدہ اور مذہبی صحیفوں کی روشنی میں ان مقررین نے بتایا کہ عورت کو فطرتاً کمزور بنایا گیا ہے، فطرت کے اس راز کی تفسیر بتاتے ہوئے حزب مخالف کے مقررین نے کہا کہ عورت کا اصل مقام گھر ہے اور یہ صنف نازک گھر کی چار دیواری کے اندر ہی اپنی پیدائش کا اصل مقصد پورا کر سکتی ہے۔ قائد ایوان کی اس دلیل کا رد پیش کرتے ہوئے کہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عورتوں میں قدرت نے حکمرانی کا جوہر رکھا ہے۔ حزب اختلاف کے مقررین نے کہا کہ اگر یہ بعض عورتوں نے حکمرانی کی ہے لیکن حکمرانی کے پس پردہ کسی مرد کا ہاتھ تھا۔ دوم ان کی حکمرانی بہت مختصر رہی اور ان کی حکمرانی کا خاتمہ ہی اس بات پر دال ہے کہ وہ مردوں کی حکمران نہیں بن سکتیں۔

اختتام مباحثہ پر جب ایوان کی رائے لی گئی۔ تو ایوان نے بھاری اکثریت سے قرارداد کو رد کر دیا۔ اس مباحثہ میں گارڈن کالج راولپنڈی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، گورنمنٹ کالج لائل پور، گورنمنٹ ٹریننگ کالج بہاولپور، اسلامیہ کالج لائل پور، گورنمنٹ انٹر کالج بہاولپور، ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا اور گورنمنٹ کالج لاہور کے مقررین نے حصہ لیا۔ مجموعی طور پر تقاریر کا معیار بہت اچھا تھا۔

اس موقعہ پر منصفی کے فرائض جناب کرامت حسین

ہمارے سالانہ مباحثے

تین اور چار فروری کو کالج یونین کے زیر اہتمام ہمارے کالج کے آٹھویں آل پاکستان بین الکلیاتی انگریزی اور اردو مباحثے اپنی روائتی شان کے ساتھ منعقد ہوئے۔ ان دنوں کالج کے حلقوں میں خوب چہل پہل اور رونق رہی۔ ان مباحثات میں مغربی پاکستان کے متعدد کالجوں نے اپنے نمائندے بھجوائے۔

انگریزی مباحثہ:

یہ مباحثہ ۳ فروری کو سات بجے شام کالج ہال میں شروع ہوا۔ مباحثہ کی صدارت کے فرائض فضل احمد سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ کالج یونین نے ادا کئے۔ ابتدائی کارروائی کے بعد صاحب صدر نے کالج کے مقرر سید مشہود احمد شاہ کو قائد ایوان کی حیثیت سے قرارداد پیش کرنے کے لئے بلایا۔ قرارداد زیر بحث یہ تھی "Men are ruled by Women" آپ نے قرارداد کے حق میں متعدد دلائل دیئے۔ اور ایوان سے پرزور الفاظ میں اپیل کی کہ وہ آج کی قرارداد کو منظور کرلیں۔ اس کے بعد نور محمد چانڈیو حزب اختلاف کے قائد کی حیثیت سے قرارداد پر بحث کرنے کیلئے آئے۔ آپ نے کئی دلائل دیتے ہوئے کہا کہ عورتیں مردوں کی حکمران نہیں بن سکتیں۔ بعد ازاں دوسرے کالجوں کے مہمان مقررین نے تقاریر کیں۔ قائد ایوان اور ان کے ساتھی اس بات پر مصر تھے کہ عورتیں مردوں پر حکمرانی کرتی ہیں۔ حکمرانی کی مختلف توجیہیں پیش کرتے ہوئے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ عورت مرد کے جذبات اور احساسات پر حکمرانی کرتی ہے۔

حزب مخالف کے مقررین کا یہ موقف تھا کہ عورت کا کردار اضافی ہے۔ علوم جدیدہ اور مذہبی صحیفوں کی روشنی میں ان مقررین نے بتایا کہ عورت کو فطرتاً کمزور بنایا گیا ہے، فطرت کے اس راز کی تفسیر بتاتے ہوئے حزب مخالف کے مقررین نے کہا کہ عورت کا اصل مقام گھر ہے اور یہ صنف نازک گھر کی چار دیواری کے اندر ہی اپنی پیدائش کا اصل مقصد پورا کر سکتی ہے۔ قائد ایوان کی اس دلیل کا رد پیش کرتے ہوئے کہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ عورتوں میں قدرت نے حکمرانی کا جوہر رکھا ہے۔ حزب اختلاف کے مقررین نے کہا کہ اگرچہ بعض عورتوں نے حکمرانی کی ہے لیکن حکمرانی کے پس پردہ کسی مرد کا ہاتھ تھا۔ دوم ان کی حکمرانی بہت مختصر رہی اور ان کی حکمرانی کا خاتمہ ہی اس بات پر دال ہے کہ وہ مردوں کی حکمران نہیں بن سکتیں۔

اختتام مباحثہ پر جب ایوان کی رائے لی گئی۔ تو ایوان نے بھاری اکثریت سے قرارداد کو رد کر دیا۔ اس مباحثہ میں گارڈن کالج راولپنڈی، پنجاب یونیورسٹی لاہور، گورنمنٹ کالج لائل پور، گورنمنٹ ٹریننگ کالج بہاولپور، اسلامیہ کالج لائل پور، گورنمنٹ انٹر کالج بہاولپور، ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا اور گورنمنٹ کالج لاہور کے مقررین نے حصہ لیا۔ مجموعی طور پر تقاریر کا معیار بہت اچھا تھا۔

اس موقعہ پر منصفی کے فرائض جناب کرامت حسین

صاحب جعفری پرنسپل گورنمنٹ کالج لائل پور، جناب سیّد داؤد احمدؒ صاحب پرنسپل جامعہ احمدیہ ربوہ اور جناب پروفیسر بشارت الرحمٰن صاحب ایم اے نے ادا فرمائے۔ منصفین کے فیصلہ کے مطابق پنجاب یونیورسٹی کے محمود عالم اوّل۔ جی، ٹی کالج بہاولپور کے مظہر الاسلام دوم۔ ہمارے کالج کے سید مشہود احمدؒ اور نور محمدؒ چانڈیہ بالترتیب سوم اور چہارم قرار پائے۔ لیکن چونکہ ہمارے مقرّرین انعامات کے لئے نہیں بلکہ صرف پوزیشن کے لئے مقابلہ میں شامل ہوئے تھے۔ اِسلئے سوم اور چہارم انعامات بالترتیب گارڈن کالج راولپنڈی کے مسعود غازی اور گورنمنٹ کالج لائل پور کے ممتاز احمدؒ کے حصّہ میں آئے۔ ٹرافی پنجاب یونیورسٹی کے حصّہ میں آئی۔ ساڑھے دس بجے شب کے قریب صاحب صدر نے مباحثہ کے اختتام کا اعلان کیا۔

اُردو مباحثہ :

یہ مباحثہ اگلے روز چار فروری کو پونے آٹھ بجے شروع ہوُا۔ قرار داد زیر بحث تھی۔ "معاشرہ کی اصلاح قانون سے نہیں اخلاقی اقدار سے وابستہ ہے"۔ تلاوتِ کلام پاک کے بعد مسٹر فضل احمدؒ سٹوڈنٹ پریذیڈنٹ، نے عطاء المجیب صاحب راشد کو قائدِ ایوان کی حیثیت سے قرار داد پیش کرنے کو کہا۔ راشد صاحب نے متعدد دلائل دیتے ہوئے کہا کہ معاشرہ کی اصلاح صرف اور صرف اخلاقی اقدار سے ہو سکتی ہے۔ آپ نے کہا کہ ہمیں قانون کی قوّت سے انکار نہیں لیکن ہمیں اس قوّت کے نتائج سے انکار ہے۔ قانون کی قوّت جسم کو تو مطیع کر سکتی ہے لیکن وہ قلوب اور اذہان کو فتح نہیں کر سکتی۔ آپ نے کہا کہ تسخیر قلوب صرف اور صرف اخلاقی اقدار سے ممکن ہے۔ آپ کی تقریر کے بعد کالج کے ایک اور مقرّر محمدؐ افضل مبشّر قائد حزبِ اختلاف کی حیثیت سے قرار داد کی مخالفت کرنے آئے۔ اپنی تقریر کے دوران انھوں نے کئی دلائل قرار داد کی مخالفت میں پیش کئے۔ آپ نے کہا۔ کہ قانون اور اخلاقی اقدار لازم و ملزوم ہیں۔ اِسلئے انکو علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ قانون اور اخلاقی اقدار کا ایک موزون امتزاج ہی معاشرہ کی اصلاح کر سکتا ہے۔

قائد اقتدار اور قائد اختلاف کے بعد دیگر کالجوں کے مقرّرین نے قرارداد کے حق میں اور خلاف تقاریر کیں۔ صاحبِ صدر نے ایوان کی رائے طلب کی تو دونوں طرف رائے دینے والوں کی تعداد بڑی حد تک متوازن تھی، تاہم ایوان نے ایک قلیل تعداد کی اکثریت سے قرارداد کو مسترد کر دیا۔ لیکن صاحبِ صدر نے اپنے خاص اختیارات بروئے کار لاکر قرار داد منظور کر لی۔

اِس مباحثہ میں ہمارے کالج کے مقرّرین کے علاوہ ذیل کے پندرہ کالجوں کے مقرّرین نے حصّہ لیا۔ گورنمنٹ کالج لائل پور۔ ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا۔ اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور۔ گورنمنٹ کالج لاہور۔ گورنمنٹ ٹریننگ کالج بہاولپور۔ گورنمنٹ انٹر کالج جہلم۔ گورنمنٹ کالج کوئٹہ۔ اسلامیہ کالج لائل پور۔ یونیورسٹی اورنٹیل کالج لاہور۔ گورنمنٹ کالج بہاولپور۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور۔ اسلامیہ کالج گوجرانوالہ۔ گورنمنٹ کالج منٹگمری۔ تعلیم الاسلام کالج گھٹیالیاں۔ ایویلیو ایٹر کالج لائل پور۔

مباحثہ میں منصفین کے فرائض جناب مرزا عبدالحق صاحب

ایڈووکیٹ سرگودھا۔ جناب شیر محمدؐ صاحب اختر مدیر ہفت روزہ "قندیل" لاہور اور مولانا جلال الدین صاحب شمس سابق امام مسجد لنڈن نے ادا فرمائے۔ ججوں کے فیصلہ کے مطابق عطاء اللہ صاحب اسلامیہ کالج لائلپور اوّل، ہمارے کالج کے محمد افضل صاحب مبشّر دوم اور عطاء المجیب صاحب راشد سوم قرار پائے۔ چونکہ حسبِ روایت ہمارا کالج مباحثہ میں صرف پوزیشن کیلئے شامل ہوا تھا۔ اسلئے دوسرے اور تیسرے انعام کے حقدار اختر حسین صاحب ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا اور ریاض احمد صاحب گورنمنٹ کالج منٹگمری قرار پائے۔ ہمت افزائی کا انعام محترم پرنسپل صاحب کے فیصلہ کے مطابق ارشاد احمد صاحب انٹر کالج جہلم کے حصّہ میں آیا۔ اِس مباحثہ کی ٹرافی ڈی مونٹ مورنسی کالج سرگودھا کے حصّہ میں آئی۔ اُردو مباحثہ کے اختتام پر ڈاکٹر زیڈ۔ اے۔ ہاشمی وائس چانسلر زراعتی یونیورسٹی لائل پور نے کامیاب ٹیموں اور مقرّرین میں انعامات تقسیم فرمائے۔

ادارۂ المنار کامیاب ٹیموں اور مقرّرین کی خدمت میں دِلی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

چند استقبالیہ تقاریب:

مباحثوں کی یہ رپورٹ نامکمل رہے گی اگر ۱۴ فروری کو اِس موقعہ پہ ہونے والی بعض استقبالیہ تقاریب کا ذکر نہ کیا جائے۔ مہمان خانہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام میں مہمان مقرّرین کے ظہرانہ کا اہتمام کیا گیا۔ عصر کے وقت جامعہ احمدیہ کی طرف سے ایک پُر تکلّف دعوت چائے دِی گئی۔ اِس موقعہ پر جامعہ احمدیہ کی طرف سے مقرّرین کی خدمت میں خوش آمدید کہی گئی اور انھیں اِس ادارہ کے مقاصد اور سرگرمیوں سے آگاہ کیا گیا۔ شام کو اردو مباحثہ سے قبل مہمان مقرّرین اور ربوہ کے بعض دیگر احباب نے کالج کے سالانہ ڈِنر میں شرکت فرمائی۔

سو سال تک جینے کے بعض اصُول:

۱۔ کھُلی ہوا۔
۲۔ جلد بستر پر جانا اور صبح جلدی اُٹھنا۔
۳۔ کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ سات گھنٹے سونا۔
۴۔ کمرہ میں روشنی نہ ہو لیکن کھڑکیاں کھُلی ہوں۔
۵۔ چائے، قہوہ، شراب، تمباکو چھوڑ دو۔
۶۔ دِن بھر میں ایک دفعہ سے زیادہ گوشت نہ کھاؤ۔
۷۔ غم و غصّہ سے بچو۔ دماغی کام زیادہ نہ کرو۔
۸۔ خُدا کی یاد میں محو رہو۔
۹۔ موسم کے مطابق کھاؤ پیو۔ (مُرسلہ محمد اکرم شاہد)

نظرِ انتخاب

مُرسلہ مسعود اختر ملک

(۱) یار ہوتے تو مجھے مُنہ پہ بُرا کہہ دیتے
بزم میں میرا گِلہ سب نے کیا میرے بعد (شہزاد)

(۲) کارِ مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں!
تلخیٔ مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں (حفیظ)

(۳) اگر یقینِ رسائی ہے اُن کی منزل تک
تو پھر گزار دو شعلوں کے درمیان سے مجھے (صبا)

(۴) زندگی ایک تبسّم کی تمنّا تک ہے
پھول کھِلتے ہیں تو کھِلتے ہی بکھر جاتے ہیں (روشن)

ڈاکٹر سلطان محمود شاہد ایم ایس سی (علیگ)
پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)

شادی!!

یہ مضمون محترم شاہد صاحب نے آج سے گیارہ برس پیشتر لکھا تھا۔ شادی کا نئے طلباء سے تعارف کرانے کے لئے "المنار" میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے —— (ادارہ)

یہ عنوان دیکھتے ہی آپ سوچیں گے کہ راقم الحروف شادی کے فلسفہ پر کچھ لب کشائی کیا چاہتا ہے یا پھر شادی کی کسی تقریب کا نقشہ کھینچنے لگا ہے۔ مگر صاحب نہیں! بندہ کو فلسفہ سے دُور کا بھی لگاؤ نہیں۔ (گو ہمارے فلسفہ کے پروفیسر صاحب میرے مقابل ہی رہتے ہیں)۔ اور شادی کی تقریبات ایسی انوکھی نہیں ہوتیں کہ میں آپ سے زیادہ کوئی معلومات رکھتا ہوں۔

در اصل شادی ہمارے کالج میں دن کا چوکیدار ہے، آئیے! اِن حضرت سے ملاقات کیجئے۔

اگر آپ اجنبی ہیں اور کالج کے دروازے میں قدم رکھتے ہیں، تو فوراً دو آوازیں یکے بعد دیگرے آپ کے کانوں میں پہنچیں گی۔ "کون ہو جی! کیہنوں ملنا اے جی!!" اور اسکے معاً بعد ہی ایک درمیانے قد کا آدمی جسکے کُرتہ کے اُوپر کے دو بٹن غائب۔ بڑا سا گول سر۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ ماتھے سے رُخساروں تک ناک غائب۔ مگر ہونٹوں سے ذرا اُوپر کو اِسکے کچھ آثار مِل جاتے ہیں۔ سر کے بال خشخاشی۔ گھٹنوں سے ذرا نیچا تہبند۔ ایک ہاتھ میں چابیوں کا بڑا سا گچھا لئے آپ کے سامنے سوالیہ علامت کی شکل میں آ موجود ہوگا۔ بس یہی شادی ہے، ہمارے کالج کا دِن کا چوکیدار۔ اور پیشتر اسکے کہ آپ اُسکے پہلے سوالوں کا جواب دیں، وہ کہنا شروع کر دیگا۔ "اجازت نہیں جی! پرنسپل صاحب گئے (غصہ) ہوندے نوں جی۔ اچھا تے تسی کِسے نوں ملنا اے جی! تد سامنے دے دفتر وِچ چلے جاؤ جی"۔ یہ سب باتیں وُہ ایک ہی سانس میں کہکر گیٹ کے برابر ہی ساتھ پڑے ہوئے اپنے بنچ پر دوبارہ بیٹھ جائیگا۔ اور آپ حیرانی سے مُڑ مُڑ کر اُسکی طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھ جائینگے۔

شادی کالج میں صرف دِن کا ہی چوکیدار نہیں۔ وُہ کالج سے متعلّق ہر چیز اور ہر فرد بشر کا بھی چوکیدار ہے۔ نہایت چُست اور محنتی۔ پرنسپل صاحب سے لیکر طالبعلموں تک، اور آفس سپرنٹنڈنٹ سے لیکر چپڑاسیوں تک شاذ ہی کوئی ایسا شخص ہو جو شادی سے کام نہ لیتا ہو۔ مگر آفرین ہے اِس شخص کو۔ کیا مجال کہ اِسکے ماتھے پر شِکن بھی پڑ جائے یا طبیعت میں مَیل آئے جِس نے جِس طرف بھیجدیا اُسی طرف ہولیا۔ چنانچہ آپ کالج کے کِسی گوشے میں کھڑے ہوں، ہر پانچ منٹ کے بعد شادی آپکے پاس سے گذر جائیگا اور غالباً اِسی لئے لڑکے اِسکو اومنی بس نمبر ا کہتے ہیں۔

شادی میں ایک اور خصوصیت ہے کہ آپکا نام خواہ کچھ بھی ہو، اُسکی سمجھ میں وُہ نام جس طرح آجائیگا وُہ بلا تکلّف اُسے دُہراتا رہیگا۔ یا پھر دو تین ناموں کو مِلا جُلا کر ایک ہی نام بنا لیتا ہے۔ مثلاً ہمارے حساب کے پروفیسر جناب راجہ مقبول الٰہی صاحب، دفتر کے اکاؤنٹنٹ محفوظ الرحمٰن صاحب اور فزکس کے ڈیمانسٹریٹر محبوب الٰہی صاحب کو ایک ہی نام اور وُہ بھی "موقوف صاحب" کہکر ہی بُلائیگا۔ خواہ اُسے کتنا ہی سمجھائیے، بڑھائیے۔ اِسی طرح محترم پروفیسر صوفی بشارت الرحمٰن

صاحب کو صوفی بشارت الہام صاحب کہکر یاد کرتا ہے۔

ایک دفعہ دفتر والوں نے شادی سے کہا کہ مرزا خورشید احمد طالبعلم سیکنڈ ایئر کو بلا لاؤ! - چنانچہ وہ کلاس میں گیا اور کہنے لگا۔ کہ "مرزا اسکنڈیا" کو دفتر میں بلاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے؟ کوئی حد ہے اسکے مخفف بنانے کی۔ اور سُنیئے! ایک دفعہ مکرم فیضی صاحب نے شادی کو میرے پاس بھیجا۔ وُہ آیا اور کہنے لگا — "شاہ صاحب جی! پھیضی صاحب نے پلیٹ پھارم مانگا ہے"۔
اب مَیں سوچنے لگا کہ اِس پلیٹ فارم کو کِسی لفظ سے مطابقت دی جاسکتی ہے کہ کچھ اتا پتا چلے۔ اُسوقت مَیں بی، ایس، سی کی کلاس لے رہا تھا۔ لڑکوں سے کہا کہ وُہ بھی اِس لفظ کو مطابقت دینے میں میری مدد کریں۔ مگر سب کی کوششیں بے سُود رہیں۔ مجبوراً شادی سے کہا کہ فیضی صاحب سے لکھوا کر لاؤ۔ چنانچہ جب رُقعہ آیا تو معلوم ہُوا کہ انہوں نے مضمون طلب کیا ہے۔

ایک دفعہ پرنسپل صاحب کسی کام کو اپنے کمرے سے باہر گئے۔ اسی اثنا میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو شادی دَوڑا ہُوا آیا اور رسیور اُٹھا کر کان سے لگا لیا۔ آواز آئی۔ "ہیلو"۔ شادی ہلنے لگا۔ پھر آواز آئی۔ "ہیلو"۔ شادی اور ہلنے لگا۔ اَب ذرا کڑک کر آواز آئی "ہیلو"۔ تو شادی کہنے لگا۔ "او جی ہلنا ں تے پیاں آں ہور کی کیندے او"۔

شادی سے جب کہا جائے کہ بھائی تمہاری شادی کرا دیں، تو وُہ جابیوں کا بڑا سا گچھا ہاتھوں میں چھنکا کر ایک جمائی لیتا ہے، اُسکی آنکھوں میں چمک آجاتی ہے اور مُسکرا کر کہتا ہے۔ "اچھا جی"۔

شادی گانا بھی ہے مگر اُس سے گانا ماہرین ہی سُن سکتے ہیں۔ شادی کی عادات کے ماہر — جب شادی سے کہا جائے کہ بھئی گانا تو سُناؤ۔ تو اُسکے چہرے پر احساسِ برتری اور فاتحیت کی لہر سی دَوڑ جائیگی۔ وُہ ایک پاؤں پہ آدھا چکر کاٹ کر کہتا ہے "چھڈو وی جی"۔ اِسکے بعد آپ ہزار کوشش کریں کہ شادی گانا سُناؤ۔ مگر وُہ یہی کہتا رہیگا کہ "چھڈو وی جی"۔ "مینوں نہیں گانا آوندا جی"۔ مگر جب آپ اُس سے یہ کہدیں کہ اچھا نہیں سُنانا تو بھاگ جا! کسی اَور سے ہم اچھا سا گانا سُن لینگے۔ تو فوراً ہی اُسکے اَبرو تن جائینگے۔ آنکھوں میں غیرت کا احساس جاگ اُٹھیگا۔ وُہ محسُوس کرتا ہو گویا اُسکی ہتک ہوگئی! اور پھر فوراً ہی چہرے پر مُسکراہٹ لاکر وُہ گانا شروع کر دیتا ہے۔ اپنے دلیس کا مرغوب گیت، وادیٔ چناب کا رنگین گیت۔ "ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر . . . . " اور جب گاتے ہُوئے اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے، اور رگیں پھُول جاتی ہیں۔ تو ایک دَم گانا ختم کر کے کہتا ہے۔ "کیوں جی! ہُن تے خوش او نا؟"

شادی روزوں کا بہت پابند ہے، گو نماز سے اُسے قطعاً رغبت نہیں۔ شاید اِسلیئے اُسے پڑھنی نہیں آتی۔ چنانچہ گذشتہ ماہِ رمضان میں جبکہ شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی، شادی باقاعدہ روزے رکھتا رہا۔ باوجودیکہ عین دوپہر کے وقت بھی وُہ دُوسروں کے کاموں میں مارا مارا پھرتا رہتا تھا۔ ایک ایسے ہی موقعہ پر دوپہر کے وقت جبکہ وُہ اپنا کُرتہ کندھے پر ڈالے پسینہ سے تر بتر ایک کام سے واپس آیا۔ تو مَیں نے اُس سے کہا۔ "شادی! تم اِتنا کام کرتے ہو روزوں میں ناغہ کر لیا کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بیمار پڑ جاؤ"۔ تو کہنے لگا۔ "شاہ صاحب جی! جدوں تک مُگدی اے آدمی نکاندا جاوے"۔

شادی کو کالج سے اُنس ہو گیا ہے، غیر فانی اُنس، کالج کی ہر چیز سے اُنس۔ اُسے کہا جائے۔ شادی تمہیں کسی اور جگہ زیادہ تنخواہ پر نوکر رکھوا دیں۔ تو وُہ اپنے بڑے سے گول سر پہ ہاتھ پھیرتے ہُوئے رِقّت آمیز لہجے میں کہتا ہے۔ "ہُن کتھے جانہاں اے جی ہُن ایتھے ای مراں گے جی"۔ اور پھر اُس کا گلا گویا بند ہونے لگتا ہے۔ اور وُہ مُنہ پھیر کر دُوسری طرف چلا جاتا ہے۔

قریشی اعجاز الحق
سیکنڈ ایئر (بی اے آنرز)

ہمارا نصب العین — علم و عمل

انسانی زندگی کا مقصد خدا تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے۔ کہ انسان اس کا عبد بنے اور اپنی حیات مستعار کو لہو و لعب کی بجائے اس سانچے میں ڈھالے جس سے اُسے خالق ارض و سما کی رضا حاصل ہو سکے۔ خدا تعالیٰ کی معرفت کے حصول کے لئے علم کی ضرورت ہے مگر اس کے باوجود جب تک ہم صحیح رنگ میں احکام الٰہی پر عمل پیرا نہ ہوں ہم اپنے مقصد کو نہیں پا سکتے۔ علم و عمل لازم و ملزوم ہیں۔ اور کامیابی کے حصول کیلئے ان دونوں کا وجود از بس ضروری ہے۔ اسی لئے ہم علم و عمل کو اپنا نصب العین قرار دیتے ہیں۔

اسلام کی بنیاد اس یقینی علم پر ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے آخری شریعت کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ اسلام نے ہر بات کیلئے دلیل پیش کی ہے۔ اور دلائل و براہین سے قائل کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں اکثر جگہ غور و فکر سے کام لینے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور کافروں سے خطاب ہے کہ کیا تم ان باتوں کا ابھی علم نہیں رکھتے۔ جب کہ ہم نے ہر چیز کو واضح کر دیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کسی بات کی اندھا دھند تقلید نہیں چاہتا۔ بلکہ وہ علم و بصیرت سے کام لینے کی ترغیب دیتا ہے چنانچہ اسلام میں علم کے حصول کے لئے انتہائی تاکید کی گئی ہے ہادیٔ برحق علیہ التحیات والتسلیمات کا ارشاد ہے طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم و مسلمۃ (ابن ماجہ)

یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض ہے اور اس ہدایت پر آپ کو اتنا اصرار تھا کہ ایک دوسری حدیث میں فرماتے ہیں کہ "علم سیکھو خواہ اس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے" یاد رہے کہ اس زمانہ کے حالات کے لحاظ سے چین کا ملک نہ صرف عرب سے بہت دُور تھا۔ بلکہ اس کے رستے بھی ایسے مخدوش تھے کہ وہاں تک پہنچنا غیر معمولی اخراجات اور غیر معمولی کوفت اور غیر معمولی خطرے کا موجب تھا اس لئے آپؐ نے چین کے ملک کو مثال کے طور پر بیان فرما کر دراصل اشارہ کیا ہے کہ خواہ تمہیں علم حاصل کرنے کیلئے کتنی ہی تکلیف اٹھانی پڑے تمہیں اس کے حصول کا دروازہ کھولنا چاہیئے۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ ابتدائی مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سننے کے لئے سینکڑوں میل کا سفر اور غیر معمولی اخراجات برداشت کر کے صحابہؓ کی تلاش میں پہنچتے تھے۔ چنانچہ قیس بن کثیر مدینہ سے سینکڑوں میل چل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابو درداؓ کے پاس ایک حدیث سننے کے لئے دمشق گئے۔ ابو درداؓ نے شارع علیہ السلام کی یہ حدیث سنائی۔

من سلک طریقا یطلب فیہ علما سلک اللہ بہ طریقاً الی الجنۃ وان الملائکۃ لتضع اجنحتہا رضیً لطالب العلم وان العالم لیستغفرلہ من فی السمٰوٰت ومن فی الارض حتی الحیتان

فی الجماعۃ۔ فضل العالم علی العابد کفضل القمر علی سائر الکواکب ان العلماء ورثۃ الانبیاء۔"

(ترجمہ) جو شخص علم طلب کرنے کیلئے کسی راستہ میں چلا تو اللہ تعالیٰ جنت کے راستہ میں اس کے ساتھ چلے گا۔ اور فرشتے علم کے طلب کرنے والے پر خوشی سے اپنے پر بچھاتے ہیں اور عالم شخص کے لئے زمین و آسمان کی تمام چیزیں مغفرت چاہتی ہیں یہاں تک کہ پانی کی مچھلیاں بھی اور عالم کو عابد پر وہی فضیلت حاصل ہے جو چاند کی ستاروں پر۔ بیشک عالم نبیوں کے وارث ہیں۔"

ایک اور حدیث میں شارع علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ایک ایسے عابد انسان کے مقابلہ پر جو اپنی عبادت کے باوجود علم سے خالی ہے ایسا ہے کہ جیسے عام ستاروں کے مقابلہ پر چودھویں رات کا چاند ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث میں فرماتے ہیں کہ ایک عالم انسان شیطان پر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

اسی طرح سرور کونین رحمۃ للعالمین کا ارشاد ہے کہ میری امت کی بہترین بھلائی نیک علماء میں ہے۔ اسی طرح آپ فرماتے ہیں کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔ یعنی میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ جسطرح وہ لوگوں کی ہدایت کا موجب تھے اور منبع رشد و ہدایت تھے۔ اسی طرح میری امت کے علماء بھی ہدایت اور کامیابی کے ضامن ہیں۔ اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ علماء کا مقام بہت اعلیٰ و ارفع ہوتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من سلک طریقاً یلتمس فیہ علماً سھل اللہ لہ بہ طریقاً الی الجنۃ۔"

یعنی جو شخص علم حاصل کرنے کی غرض سے کسی راہ کو اختیار کرے اللہ اس کے لئے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

اہل علم کا وجود دنیا کی اصلاح کیلئے نہایت ضروری ہے علماء کا فقدان گمراہی کا موجب ہو سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "اللہ تعالیٰ علم کو بندوں سے چھین کر نہیں سمیٹتا بلکہ علم کا سمیٹنا علماء کی وفات سے ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی عالم زندہ نہیں رہتا تو لوگ جاہل آدمیوں کو اپنا سردار بنا لیتے ہیں اور ان سے مسائل دریافت کرتے ہیں جو بغیر علم کے فتویٰ دیتے ہیں اور اس طرح لوگوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ اور خود بھی گمراہ ہوتے ہیں"

الغرض اسلام میں علم کے حصول کی انتہائی تاکید کی گئی ہے اور سچے علم کو وہ مقام تسلیم کیا گیا ہے جو ایمان کے بعد کسی دوسری چیز کو حاصل نہیں اور پھر علم کو ایک غیر محدود چیز قرار دیکر ہدایت کی گئی ہے کہ خواہ تمہیں کتنا ہی علم حاصل ہو جائے پھر بھی مزید علم کے حصول کی کوشش کرتے رہو۔ چنانچہ خود فخر موجودات سرور کائنات سید الرسل حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن شریف میں یہ دعا سکھلائی گئی ہے کہ "رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا" یعنی اے رسولؐ ہمیشہ یہ دعا مانگتے رہو خدایا میرے علم میں ترقی عطا کر۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف مردوں کو بلکہ عورتوں کو بھی علم حاصل کرنے کی تاکید کی ہے لہذا مسلمانوں کو چاہئیے کہ وہ علم کے لحاظ سے ایسے مقام پر پہنچیں کہ دوسری قومیں گرد کارواں بن کر رہ جائیں۔ پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث ما وجدھا فھو احق بھا (ترمذی)

یعنی حکمت اور دانائی کی بات تو مومن کی اپنی کھوئی ہوئی چیز ہے اُسے چاہئیے کہ جہاں بھی اُسے پائے لے لے کیونکہ وہی اس کا بہتر حقدار ہے اس حدیث میں آپ نے علم کے حصول کا ایک ذریعہ بتایا ہے

علم ایک ایسی چیز نہیں جو صرف مخصوص حلقوں میں بیٹھ کر یا کتابیں پڑھ کر ہی حاصل ہو سکے بلکہ وہ ایک وسیع چیز ہے جسے ایک ہوشمند انسان صحیفۂ عالم کی ہر تجلی سے حاصل کر سکتا ہے علم کا شوق رکھنے والے کیلئے کائنات کی ہر چیز ایک علمی کتاب ہے جس سے وہ اپنی استعداد کے مطابق علم کے خزانے بھر سکتا ہے۔ ہمارے آقا فرماتے ہیں کہ جب بھی کوئی علمی بات تم کہیں پاؤ فوراً محفوظ کر لو اور اپنا لو۔

"قرآن مجید علم و حکمت کا وہ سمندر ہے جو کبھی خشک نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ" یعنی ہمارے پاس (قرآن میں) ہر قسم کے روحانی اور علمی خزانے موجود ہیں مگر ہم انہیں فیصلہ شدہ اندازے کے مطابق صرف حسب ضرورت ظاہر کرتے ہیں۔" قرآن مومن کا اپنا خزانہ ہے اسلئے چاہیئے کہ ہم اسکے علمی چشموں سے سیراب ہوں اور علم حاصل کریں۔

محولہ بالا احادیث سے صاف ظاہر ہے کہ علم بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ علم ہماری ترقی کے زینے کا پہلا قدم ہے کیونکہ علم کے بغیر ہم ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکتے مگر جب تک ہم اپنے علم کو عملی رنگ میں پیش نہ کریں ہم کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے۔

ہمارے پاس اسلام کی پیش کردہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم موجود ہے اور ایک یقینی علم یعنی قرآن مجید ہمارے پاس موجود ہے مگر جب تک ہم اسکی تعلیمات پر عمل نہ کریں ہم دوسری قوموں سے آگے نہیں نکل سکتے جب تک ہم قرآنی نظریات کو جو ایک مکمل ضابطہ حیات ہیں اپنا لائحہ عمل نہ بنائیں ہم مادی کامرانیوں اور روحانی سرفرازیوں سے ہمکنار نہیں ہو سکتے اسی لئے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ تمہارے اعمال کو مدنظر رکھکر جزا دیگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم کام کرنیکے بغیر انعام کے وارث بنجائیں۔

دنیا کی تاریخ محض افسانہ نہیں بلکہ وہ مستقبل کی آئینہ دار ہوتی ہے چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ جن قوموں نے عمل کو خیرباد کہہ کر لہو و لعب اور تن آسانی و عشرت کو اختیار کر لیا وہ صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئیں یا ذلیل و محکوم ہو کر رہ گئیں۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا باعث عمل ہے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں میں عشقِ حقیقی اور عملی روح موجود تھی اسلئے انہوں نے ایسے ایسے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے جو ان کے نام کو قیامت تک زندہ رکھنے کی ضمانت ہیں۔ انہوں نے اسلام کی خاطر اپنی جانیں قربان کر دیں۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں مسلمان آلاتِ حرب سے محروم اور اسباب ظاہری سے عاری تھے مگر قوت ایمانی سے لیس اور تائید غیبی سے معمور تھے وہ ناموس اسلام کی خاطر لڑ کر زندہ رہنے کی صورت میں غازی کہلانے کے مشتاق تھے۔ اور مر جانے کی صورت میں ابدی زندگی کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اکثر غزوات میں باوجود دشمن کی کثرت کے فتح و ظفر پائی۔ عقبہ بن نافع بربریوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور ان کو شکستوں پر شکستیں دیکر بھگا دیا۔ یہاں تک کہ خشکی ختم ہو گئی۔ اور سمندر آ گیا۔ آپؓ نے اپنا گھوڑا بحر ظلمات میں ڈال دیا۔ اور کہا "یا اللہ! اگر آگے اور زمین ہوتی تو تیری راہ میں جہاد کرتا چلا جاتا!!" تو یہ تھی عمل کی روح جو ان کے اندر موجود تھی اور یہی وہ راز تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں نے قلیل عرصہ میں قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں کو پاش پاش کر دیا۔

مگر اس کے مرورِ زمانہ سے مسلمانوں میں عملی روح باقی نہ رہی انہوں نے لہو و لعب کو اختیار کر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمانے کے شریر بادِ تھپیڑوں نے مسلمانوں کے اوجِ ثریا پر واقع آشیانے کو پھونک ڈالا اور قعر مذلت میں گرا دیا۔ مسلمانوں میں احساس فرض باقی نہ رہا جس کی وجہ سے زوال لازمی تھا۔ ۵

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

جس طرح انسانی ترقی، انسانی جد و جہد کی رہین منت ہے۔ اسی طرح انسانی جد و جہد احساسِ فرض کی زیرِ بار ہے۔ آجکل مغربی ممالک نے جو ترقی حاصل کی ہے وہ صرف علم کی بدولت نہیں ہے وہاں کے سائنسدانوں نے اپنے علم کو عملی جامہ پہنا کر نئی نئی ایجادات کی ہیں۔ ان میں احساسِ فرض موجود ہے جو ان کے اندر عمل کی روح پیدا کرتا ہے پس اگر ہم اس ترقی یافتہ دور میں اپنی منزل (مقصد) منزل کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تو ضروری ہے کہ ہم اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لائیں۔ کیونکہ ؎

عمل میں کامیابی موت میں ہے زندگی
جا لپٹ جا لہر سے دریا کی کچھ پرواہ نہ کر

دنیا کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ انسان کی بتدریج ترقی انسانوں کی مختلف اوقات میں کوشش کا نتیجہ ہے۔ ہر زمانے کے علماء اور مفکرین نے اپنے زمانے کے لحاظ سے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانوں کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کیا۔ انسانی جد و جہد نے ہی آج ہمیں پتھر اور دھات کے زمانے سے نکال کر ایٹم کے زمانہ میں لا کھڑا کیا ہے۔ غرض یہ انسان کے علم و عمل دونوں کا بیٹھا پھل ہے۔ جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور ہم اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

پس اگر ہم دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم نہ صرف معمولی علم حاصل کریں۔ بلکہ علم کی انتہا کو پہونچ جائیں۔ اور علم کو حاصل کرنا اپنا مطمحِ نظر بنائیں اور ہر وقت علم کو حاصل کرتے رہیں جہاں کہیں سے اور جس طرح سے بھی علم حاصل ہو سکے۔ اسے حاصل کریں اور پھر علم کو حاصل کر کے اس پر عمل پیرا ہوں۔ کیونکہ علم بغیر عمل کے بیکار ہے۔ جیسا کہ ابتداً ذکر کیا جا چکا ہے علم اور عمل لازم و ملزوم ہیں اور ہماری ترقی کے لئے ان دونوں کا وجود لازمی ہے ہمیں چاہیئے۔ کہ ہم ہر وقت اپنے نصب العین کو مد نظر رکھیں۔ اور جہاں تک ممکن ہو علم و عمل کو پیش نگاہ رکھ کر ارتقاء کی منزل تک بڑھیں۔ عمل کی روح اپنے اندر پیدا کریں تاکہ کوئی رکاوٹ ہمارے رستے کو مسدود نہ کر سکے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم فطرت کے اشارہ کے مطابق ہر شب کو سحر کر دیں۔ اور سرگرمِ عمل ہو جائیں اگر ہم ایسا کریں تو دنیا کی کوئی طاقت ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ ع

بڑھ رہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد

ضروری ہے کہ ہم کشمکشِ حیات میں نگاہ کی بلندی، اور عمل کی روح پیدا کریں۔ کیونکہ ارتقاء کی منزل کی طرف بڑھنے والوں کیلئے یہی رختِ سفر ہیں۔ علم و عمل کو اپنا کر ہمیں شمعِ زندگی بننا چاہیئے ؎

شمع بن کر یہ ہم ہستی میں بسر کر زندگی
تاکہ تیرے نور سے پیدا ہو سوزِ زندگی

مرسلہ محمد مجیب اصغر

دُودھ

٭ دودھ ہمیشہ ابال کر استعمال کرنا چاہیئے۔

٭ دماغی محنت کا کام کرنیوالوں کو گائے کا دودھ پینا چاہیئے۔

٭ خالی معدہ دودھ پینے سے ہضم خراب ہو جاتا ہے

٭ زخمی تھن والی گائے بھینس کا دودھ صحت کیلئے مضر ہوتا ہے۔

عبدالرشید ارشد

ہمارا نصب العین ــــ علم و عمل

ہے عمل میں کامیابی موت میں ہے زندگی
جا لپٹ جا لہر سے دریا کی کچھ پرواہ نہ کر

ہمارا نصب العین علم و عمل ہے ۔ فرداً فرداً ہر دو الفاظ بذاتِ خود کلیدِ زندگی ہیں ۔ اور ارتباطی حیثیت سے بھی ہمیں ان کو صحیح اور کامیاب نسخہ تسلیم کرنا پڑے گا ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نہ صرف انسان بلکہ تمام حیوان چرند پرند بھی اپنی افزائش کے لئے علم و عمل کے مرہونِ منت ہیں ۔ ربِ قدیر نے یہ دونوں طاقتیں یعنی علم اور عمل کی طاقتیں تمام جانوروں میں ودیعت کر دی ہیں ۔ چنانچہ جملہ چرند پرند قدرتی طور پر ان کے پورے پورے حامل ہیں ۔ فطرت نے انکو ان میں غلط روی سے خود بخود باز رکھا ہے ۔ چیونٹی جیسی بے حقیقت مخلوق جسے صرف دانہ کشی کا علم دیا ہے ۔ کس قدر علم و عمل کی حامل ہے ۔ اس کے راہِ عمل میں کوئی چیز حائل نہیں ہو سکتی ۔ اور کوئی بھی تو اس کے راستے کو مسدود نہیں کر سکتا ۔ ایک اونٹ کی طرف دیکھئے تو اسے صحرا نوردی کے التزام ازبر ہیں بن کھائے پیئے گذارہ کر لیتا ہے ــ اور بادِ سموم اور بے پناہ ریگی طوفانوں کا مقابلہ کر لیتا ہے جس سے فرشتے بھی الاماں پکار اٹھیں اسے اپنے کوہانی ذخیرے کا علم ہوتا ہے ۔ اسے اپنی آنکھوں کے حلقوں اور نتھنوں کے بلوں کا پورا علم ہے ۔ چنانچہ موقعہ پڑنے پر وہ اپنے اس علم کو کتنی خوش اسلوبی سے عمل میں لاتا ہے ۔

کسی پرندے کو لیجئے ۔ زمانۂ آفرینش سے اسکو گھونسلہ بنانے کا ایسا علم دیا گیا ہے ۔ کہ وہ اس علم پر اپنے لئے ایسے دلربا دو اقسام کے گھونسلے بناتے ہیں ۔ جسے دیکھ دیکھ کر اشرف المخلوقات کی عقل بھی حیرت میں آ گئی ۔ پھر ان کو چرنے چگنے کا علم ہوا ۔ تو اس تعلیم کی تکمیل میں انہوں نے نہ صرف اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرا ۔ بلکہ برے وقتوں کے لئے خوراک کا ذخیرہ بھی جمع کر لیا ۔ یہ کیا تھا؟ صرف علم و عمل کی برکت اور بس ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے انسان کو مختارِ کل بنا دیا ۔ کیونکہ اسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف حاصل ہونے والا تھا ۔ اسے جانوروں اور حیوانوں کی طرح فطرتی علم نہیں سکھایا ۔ بلکہ اس کو سمجھ اور عقل ودیعت کی تاکہ وہ علم حاصل کرے اور اسے بروئے کار لائے ۔

آپ دیکھتے ہیں کہ انسان نے علم کے بدلے کیا کچھ عمل نہیں کیا ۔ ان میں ایک انسان تو وہ ہیں جنہوں نے علم و عمل کے سلسلے میں بڑی بے اعتنائی برتی ۔ جس سے یہ ہوا کہ وہ انسان جانوروں کی طرح غاروں میں رہنے لگے اور وحشیانہ حرکتیں کرنا ان کا شعار رہا ۔ اور کچھ انسان اور قومیں ایسی بھی

ہوئیں جنہیں علم تو حاصل تھا۔ مگر ان کے قدم نہ اُٹھ سکے۔ چنانچہ وہ لوگ پسماندہ رہ گئے۔ باقی دوسرے انسان ہیں۔ جنہوں نے علم و عمل کو اپنایا وہ قومیں سب پر سبقت لے گئیں۔ آج امریکہ اور روس جن کا نقطہ یہ علم و عمل تھا اوجِ ثریا پر پہنچ گئیں۔ اور باقی قومیں آج ان کی قابلیت کو دیکھ دیکھ کر حیران اور لرزاں ہیں۔ اُن پر اُن کا خوف مسلط ہو گیا ہے۔ مگر امریکہ اور روس کشاں کشاں ہزار روز افزوں آگے بڑھ چکے ہیں فلک پیمائی ان کا مرغوب مشغلہ ہے اور چاند ستاروں تک رسائی ان کا معمولی شعار۔ ان قوموں نے اپنے علم کو میدانِ عمل میں لا ڈالا اور عمل پیرائی نے اپنا کام کر دکھایا۔ روزمرہ کی معاشی زندگی میں بھی ہر انسان کو علم و عمل کی جامع صفات سے شناسائی کرنا خاص اہمیت رکھتا ہے جو انسان اپنے علم پر پوری طرح عامل ہے۔ اس کے سامنے ترقی کے وسیع میدان پڑے ہوئے ہیں۔ جو انسان کی قدم بوسی کے لئے ہر وقت کمربستہ تیار رہتے ہیں۔ پس وہی شخص ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ جو مذکورہ اہمیت سے ہمکنار ہو۔ جب کہ دوسرے وسوسوں کے گھیرے میں پھنس جاتے ہیں اور ان کے قدم میدانِ عمل میں ڈگمگا جاتے ہیں۔ وہ ایسے مسافر ہیں جو راہ سے بھٹک جاتے ہیں اور کسی منزل تک پہنچنے نہیں پاتے۔

نہ صرف دنیاوی امور ہی علم و عمل کے اکتساب سے سلجھائے جا سکتے ہیں۔ بلکہ دینی مسائل بھی بروئے کار لانے کے لئے علم و عمل کے ہی مرہونِ منت ہیں جو لوگ دین کے عالم ہوں مگر ان میں عمل عنقا ہو۔ تو ان کا علم کسی کام کا نہیں۔ بیان کیا گیا ہے کہ ایسے عالم ایسے گدھوں کی مثال ہیں جو بڑی بڑی علمی کتابوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہے ہوں۔ ایسے عالموں کی رسائی کبھی روحانی منزل تک نہیں ہو سکتی۔ مگر وہ عالم جسے خدائے بزرگ تر کی طرف سے علم کے علاوہ راہِ عمل بھی معلوم ہو جائے تو وہ اوجِ طور پہ خالقِ قدرت سے ہم کلامی کا مرتبہ پا سکتا ہے۔

ہم ہر روز بارگاہِ ایزدی میں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ پڑھتے ہیں۔ تا آنکہ راہِ عمل کی بھیک مل جاوے۔ یہ یاد رہے کہ علم و عمل بہر صورت لازم و ملزوم ہیں۔ یعنی علم بغیر عمل بے فائدہ ہے۔ اور عمل علی ہذا القیاس علم کے بغیر بے سود اور بے کار ہے۔

چنانچہ ایسے بھی اشخاص ہیں۔ جو راہِ عمل پر گامزن تو ہیں۔ مگر علم سے بے بہرہ ہیں۔ ایسے لوگ کبھی کسی صورت منزلِ مقصود سے فیضیاب نہیں ہوتے ان کی مثال ایک ایسے مسافر کی ہے۔ جو راہگیر تو ہو مگر راستہ نہ جانتا ہو جو بازو ئے عمل پوری طاقت و توانائی سے مصروفِ کار رہے۔ مگر یا شخص کی حقیقت معلوم نہ ہو۔ تو وہ بازو محض تھکاوٹ کھودی ہے۔

ہمارے کسان لوگوں کی مثال ہمارے سامنے ہے وہ دیہاتی قدامت پسند ہوتے ہیں ان میں راہِ عمل کی اہم درجہ اہمیت ہے۔ انکے انتھک بازوؤں میں زور شور ہمیشہ ہوتا ہے۔ مگر کیا کریں اتنا علم نہیں کہ اپنے علم کو عمل سے ملحق کر سکیں۔ وہ نہیں جانتے کہ ٹریکٹر اور جدید آلاتِ زراعت ان کے کام میں کتنی اہمیت رکھتے ہیں اور یہ کہ ان اشیاء کی مزید ترقی ہی انکے علم و عمل کی ضرورت کا واحد جواب ہے۔ یہ وہی الحاق ہے یعنی علم و عمل

کی یک جہتی جس نے مغربی کسانوں کو آسمان تک پہنچا دیا ہے مگر ہمارے کسان اس کلیہ سے بالکل بے خبر ہیں۔

علم و عمل انسانیت کی معراج ہے مگر یہ دیکھا گیا ہے کہ دنیا میں علم و عمل کے لیے حسب کشمکش جاری ہے۔ کئی قومیں اپنے ذاتی اغراض کے لیے دوسری قوموں پر فوقیت لے جانے کے لیے تُلی بیٹھی ہیں۔ وہ اپنے علم و عمل کو مستکبرانہ طور پر بروئے کار لانے کی دھن میں لگی ہوئی ہیں۔ چنانچہ قوموں میں جاہ طلبی، خود کو منوانے کی ہوس، جہانبانی کا شوق بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ جس سے دنیا کے امن کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ کہیں یہ کشمکش قیامت کے آثار ہی نہ ہوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ہر قوم انسانی آسائش کے لیے سب کچھ کرتی۔ دنیا کی مختلف قوموں کا رجحان اپنی ہی طرف نہیں چاہیئے تھا۔ بلکہ دوسروں کی طرف بھی۔ ساری دُنیا کی طرف۔ انسانیت کی طرف من حیث القوم یہ رجحان ہونا چاہیئے تھا۔ جس سے عالمی ہمدردی، خلوص، وابستگی، ایثار، گرتوں کو تھامنے اور سہارا دینے کے جذبات کار فرما ہوتے۔ میل ملاپ اور محبت کا جذبہ پرورش پاتا اور دنیا میں ایسے لوگ ہوتے جو اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوتے بھی بہر حال ایک قوم سمجھے جاتے۔ دنیا والے ہمیشہ بچوں کی طرح معصوم ہوتے جو ایک دوسرے پر یقین کر سکتے۔ بھروسہ کر سکتے۔ اور محبت کر سکتے۔

بہر حال یہ تو جملہ ہائے معترضہ تھے۔ تو اب یہ سمجھ آ گیا یہ ثابت ہوا۔ کہ انسانی ترقی اور آسودگیش کے لئے علم و عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور جب تک یہ ساتھ قائم ہے۔ دنیا کی قومیں عروج پر عروج حاصل اور منازل پر منازل طے کرتی جائیں گی۔ اور علم و عمل کی علمبردار قوموں کا جھنڈا ہر جگہ بول بالا ہوتا چلا جائے گا یعنی ہمارا نصب العین "علم و عمل" ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی ان دونوں کو مشعل راہ سمجھیں۔ علم حاصل کرتے چلے جائیں۔ اور اس پر صحیح طور پر گامزن ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے کئی عمل کی مشق کرتے کرتے ایسا علم حاصل کر لیں جو ہمارے اور ہماری قوم کے لئے صراط مستقیم ہو۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ
صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ
غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ
(آمین)

سید غلام رسول اشنا

ورزش

- روزانہ صبح کی سیر سب ورزشوں سے عمدہ ورزش ہے۔
- جو شخص ورزش نہیں کرتا، اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ کھانا کھائے۔ کیونکہ یہ اس کا صحیح مصرف نہیں۔
- ورزش کی مقدار جسمانی طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔ اسے آہستہ آہستہ ترقی دینی چاہیئے
- جب پسینہ آ جائے اور اعضا میں تھکاوٹ محسوس ہو تو ورزش چھوڑ دینی چاہیئے۔

قرار دادِ تعزیّت

(مرسلہ مکرم چوہدری ظفر احمد وینس سٹاف سیکرٹری)

تعلیم الاسلام کالج کے اساتذہ اور طلباء کا یہ غیر معمولی اجلاس حضرت صاحبزادہ مرزا شریف احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اچانک وفات سے اس قومی وجماعتی حادثہ پر انتہائی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔

حضرت صاحبزادہ صاحب مرحوم کی ذات حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعدد الہامات کا مظہر تھی۔ اور آپ حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اس مبشر اولاد میں سے تھے جن کے متعلق حضور نے فرمایا:۔ "یہی ہیں پنجتن جن پر بنا ہے"

حضرت ممدوح اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود اپنی عمر کے آخری لمحات تک خدمت سلسلہ میں مصروف رہے۔ ناظر تعلیم اور کالج کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے آپ تعلیم الاسلام کالج کی بہبود میں گہری دلچسپی لیتے رہے۔ اور آپ کے قیمتی مشورے ہمارے لئے ہمیشہ مشعل راہ رہے آپ کا جذبۂ خدمتِ دین۔ تقویٰ وطہارت اور دینداری۔ شرافت اور اخلاقِ حسنہ آپ کے اعلیٰ اور بلند کردار کے آئینہ دار تھے۔

اس صدمۂ عظیم میں ہم اراکین سٹاف تعلیم الاسلام کالج و طلبا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز اور حضرت صاحبزادہ مرزا بشیر احمد صاحب و نیز حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ و حضرت امۃ الحفیظ بیگم صاحبہ محترمہ بیگم صاحبہ حضرت مرزا شریف احمد صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ صاحبزادہ مرزا منصور احمد صاحب۔ صاحبزادہ مرزا ظفر احمد صاحب۔ صاحبزادہ مرزا داؤد احمد صاحب محترمہ امۃ الوحید بیگم صاحبہ۔ بیگم مرزا خورشید احمد صاحب۔ محترمہ امۃ الباری صاحبہ بیگم صاحبہ میاں عباس احمد صاحب و دیگر لواحقین وپسماندگان سے گہری ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرماتے۔ آمین۔

زیر نگرانی منیر احمد خاں

افسانہ

ــــــــــــ ...؟

اس کے ہاتھوں سے تصورات ایک نیا روپ دھارتے، افسانے زندگی پاتے، کلیاں چٹکتیں، پھول کھلتے، اور زندگی کی خزاں میں کچھ دیر کے لئے بہار کا سماں ہو جاتا ــــــ

میں حسب معمول شام سے کچھ پہلے شیزان اور ٹیل کی طرف روانہ ہوا۔ شیشے کے دروازے میں کھڑا ہوا اپنا جب سلام کرتا۔ تو میں مسکرا دیا کرتا تھا۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی اس کے سلام کرنے کے باوجود میں سر جھکائے اندر داخل ہو گیا۔ ہلکا ہلکا ساز شیزان کی فضا میں ایک عجیب سا اضطراب برپا کر رہا تھا۔ وہ کونے والی میز پر اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے خلاف توقع اس کی آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو دیکھے۔ یہ آنسو موتیوں کی لڑی کی طرح ایک سفید دھاگے میں پرو دیئے گئے تھے۔ بجلی کے قمقموں کی کرنوں نے ان موتیوں میں کئی رنگ نکھار دیئے۔ یہ قطرے ایک ایک کرکے رومال کے ہونٹوں میں ٹپک رہے تھے۔ رومال بہت پیاسا تھا قطرے فوراً جذب ہو جاتے۔

میں جب نزدیک پہنچا۔ تو اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ وہ ٹکٹکی باندھے سامنے دیوار پر لٹکی ہوئی سینری کو دیکھتا رہا۔ وہ سربلند پہاڑوں کے نیچے حلقے میں لپٹی ہوئی بھرپور وادی کے ایک ایک کٹاؤ، ایک ایک قوس اور ایک ایک ابھار کو نہایت غور سے دیکھ رہا تھا میں نے دیکھا۔ کہ اس کی آنکھیں آج غیر معمولی طور پر سرخ ہیں۔ اور اس کا تمام جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا ہے۔ وہ خوش مزاج، صحت مند، فرسٹ کلاس گزیٹڈ آفیسر تھا۔ لیکن امتدادِ زمانہ نے اس کے ماتھے کی جھریوں میں ایک گہری لکیر زیادہ نمایاں کر دی تھی۔ یہ لکیر اس کے چہرے کے وقار و جلال میں اضافہ کرتی تھی۔ میں کافی دیر مبہوت بنا اس کے چہرے میں کھویا رہا۔

"اختر۔! کیا بات ہے۔ آج تم غیر معمولی طور پر غمزدہ نظر آ رہے ہو" میں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا

"دوست۔! یہ اندھی زندگی ...... ــ!"

وہ جذبات کی گہرائیوں میں سے بولا

"زندگی کے راستے بہت پیچیدہ ہوتے ہیں۔ جب ان راستوں سے کوئی واقف نہ ہو۔ تو وہ ان کی وسیع و عریض تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے ــــــ

زندگی محض ایک فریب ہے وہ ہمیں اندھا بنا کر ٹھوکریں

کھلانا نہیں چاہتی۔ بلکہ وہ تو چاند ستاروں کو ہمارا رہبر بنا کر ہمیں اپنی منزل سے بھٹکاتی ہے۔ اور دیر و حرم کی ٹھوکریں کھلاتی ہے۔ اندھے کو ٹھوکر لگتی ہے تو وہ محتاط ہو جاتا ہے۔ لیکن جب آنکھوں والے کو ٹھوکر لگتی ہے تو وہ غرور سے تن جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو اپنی آنکھوں کا مان ہے"

وہ بولتا رہا اور میرے فکر و نظر کی سوئیاں زندگی کی گھڑی پر خیالات کی بصیرت کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ بڑھتی رہیں ــــــ

وہ خاموش ہوگیا اور دیوار کی طرف ویران نظروں سے دیکھتا رہا۔ یکلخت اس نے پھر بولنا شروع کیا اس کی آنکھوں سے اب چنگاریاں برس رہی تھیں۔ میں خوفزدہ ہوگیا ــــ

"تم لوگ میرے چہرے پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ پاتے ہو تم میری ہنس مکھ طبیعت سے یہ اندازہ لگاتے ہو کہ میرے اندر خوشی کے وسیع و عریض سمندر کی لہریں موجیں مار رہی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے گذشتہ گیارہ مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی۔ جس کی وجہ سے میں زندگی سے تنگ آچکا ہوں۔ میں اس قدر دکھی ہوں کہ مجھے زندگی کی ہر شے فریب نظر آتی ہے۔ میں ہنستا ہوں، کھیلتا ہوں، لیکن میرا دل دکھ کے تیروں سے چھلنی ہو چکا ہے۔ میری روح برباد اور میرا ذہنی سکون تباہ ہو چکا ہے ــــــ

اب میں پریشان و سرگرداں ہوں ــــ قرض اور افلاس نے میری زندگی کے محلات میں آگ سلگائی۔ اور وہ سلگتی ہوئی آگ آج بھی میرے روئیں روئیں کو خاکستر کئے جا رہی ہے"

میں خاموش سر جھکائے گم سم بیٹھا رہا وہ بولتا رہا

"میرے ساتھ زندگی نے بھی مذاق کیا۔ اور زمانے نے بھی ــــ جب میں نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ تو زندگی میرے لئے خوبصورت محلات کی شکل میں نمودار ہوئی۔ جب میں نے غور سے دیکھا۔ تو میں نے دیکھا کہ ان محلات کی بنیادیں غریبوں کے پیٹوں پر تعمیر کی گئی تھیں ــــ

ان محلات کے دامن میں، میں نے چند مفلوک الحال انسانوں کی جھونپڑیاں دیکھیں جن کے ساتھ مذاق ہو رہا تھا ــــ ایک سنگین مذاق ــــ بجھے ہوئے چہرے، مدقوق اجسام، مایوسی و نامرادی کے پیکر اور ہڈیوں کے یہ ڈھانچے بلند و بالا عشرت کدوں میں رہنے والوں کا منہ چڑا رہے تھے۔ تب میں نے چاہا کہ ان بالاخانوں کو گرا دوں ــــ

اس کی یہ حالت ایک خار تھا جو میرے دل کو بری طرح چبھنے لگا۔ میرا دل بھر آیا تھا۔ میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ مجھے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا ــ کیا کہوں اور کیا نہ کہوں ــــ میں نے بولنا چاہا لیکن بولنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ بالآخر میں کچھ سنبھلا اور ڈرتے ڈرتے کہا

"اختر! گھبرانا بے فائدہ ہے۔ انسان زندگی کے مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ تم تو بہت خوش قسمت ہو کہ دنیا کی جاہ و عظمت کے علاوہ قدرت نے تمہیں قلمی صلاحیت سے بھی نوازا ہے زندہ رہنے کیلئے حالات سے سمجھوتہ کرو۔ اور حالات سے سمجھوتہ اسی صورت

یں ہو سکتا ہے۔ کہ تم افسانہ نگاری اور مضمون نویسی
کے فن سے استفادہ کرو۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا

"بہت اچھا دوست! میں اس فن سے ضرور فائدہ
اٹھاؤں گا۔ لیکن میرا ذہن آزادانہ طور پر سوچنے کا عادی
ہے خیر! میں مغربی طرزِ زندگی کا مخالف ہوں۔ اگر اس
موضوع کے متعلق کچھ لکھوں تو غالباً مدیروں کو ناگوار
نہ گزرے گا۔"

شاید ابھی کچھ باتیں اور بھی ہوتیں لیکن کھانے کا
وقت ہو چکا تھا۔ تمام لوگ اپنی اپنی میزوں پر بیٹھ چکے تھے
مجھے ایک پرانے دوست کسی نئے شخص سے تعارف کروانے
کے لئے گیلری کی طرف لے گئے۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہوتے
رہے۔ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی رہی۔ میں اپنی ہمہ تن
مصروفیات کی وجہ سے اختر کو بھول گیا۔ ایک رات میں
دن بھر کی تھکاوٹ سے چُور ہو کر بیٹھی نیند سو رہا تھا کہ
گھڑیال نے ایک بجایا۔ اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی زور
سے بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ تو بولنے والا اختر کا
چھوٹا بھائی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا

"اختر بھائی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں ہم بہت
گھبرائے ہوئے ہیں فوراً تشریف لائیے۔"

مجھے کچھ تو پہلے ہی اضطراب تھا۔ اب اس
اضطراب نے تشویش کی صورت اختیار کر لی۔ میں نے
دیوانہ وار بھاگ کر کار کا رُخ کیا۔ جب میں اختر کے گھر
داخل ہوا۔ تو وہ شور مچا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا:۔

"دوست! اچھا ہوا تم آگئے۔ میں تمہارا ہی
منتظر تھا۔ میں نے زندہ رہنے کے لئے حالات سے سمجھوتہ
کیا۔ مگر یہ سمجھوتہ زندگی کی راہ میں حائل ہو گیا۔ میں نے
تمہارے مشورے کے مطابق فن سے فائدہ اٹھایا۔
لیکن فن کی سکون سے ٹکر ہو گئی۔ فن انتہا سمندر کا
مدّ و جزر اور سکون تالاب کا ساکن پانی ——

اس پر ایک عجیب بے کیفی اور بیزاری طاری ہو
چکی تھی۔ میں نے کہا

"اختر! زندگی میں نشیب و فراز ہوتے
ہی ہیں۔ تم ثابت قدم رہو۔ تو غالب آجاؤ گے۔"

میں نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے بھی اس سے اس
ناامیدی کی وجہ دریافت کی۔ تو اس نے مجنونانہ آواز
میں بولنا شروع کیا:۔

"ایک رات جب میں اپنی حالت پر رو رہا
تھا تو میرے آنسو الفاظ بن کر میرے سامنے کاغذ پر
ناچنے لگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ الفاظ نہیں میرے افسانے
کے چند حسین کردار ہیں۔ جو میری تصوراتی قوت سے
ایک رومان خیز فضا تخلیق کر رہے ہیں۔ میرے خیالات
جمالیات کی حدّوں کو چھو رہے ہیں۔ اور —— میں
اپنے زخمی شعور کا سہارا لئے لکھتا رہا —— ایک
افسانہ کو ایک محبوب ترتیب ملی اور جب افسانہ شائع
ہوا تو محکمۂ احتساب نے اسے عریانی قرار
دے دیا —— عریانی —— ؟

میرے دوست! میں سوچتا ہوں۔ کہ میں نے
تو کبھی عریانی کا خیال بھی نہیں کیا تھا وہ تو میرے فن

کا دلپذیر عکس تھا - میں کیسے یقین دلاؤں کہ میرے دل
کے زخم ان الفاظ سے سکون پاتے تھے - یہ عریاں الفاظ
نہ تھے بلکہ جلتے ہوئے دلوں کے واسطے کافوری مرہم تھے
______ دوست! یہ جسم بے روح ہیں اور انکی
زندگی محض اداکاری ______ مجھے محسوس ہوتا ہے
کہ میں لٹی ہوئی بے بہار کائنات میں یک و تنہا رہ گیا
ہوں - میں زندگی سے تنگ آچکا ہوں - اُف - !
یہ تنہائی بھی مجھے ڈستی ہے یہ ماحول کس قدر خاموش
ہے تم سب لوگ کیوں خاموش ہو - میرا دل چاہتا ہے
کہ پاگلوں کی طرح دوڑوں، دیواریں چیر دوں، تارے
نوچ لوں - ساون کے بپھرے ہوئے طوفانوں کی طرح شعلۂ
جوالہ کی مانند، بجلی کی طرح، آندھی اور بگولوں کی رات
کی ان تاریکیوں کو چیرتا چلا جاؤں "
یہ کہہ کر وہ تیزی سے مڑا اور دوڑتا ہوا گیٹ
سے باہر کی طرف بھاگا - اس کے چھوٹے بھائی اور
میں نے اس کو روکنے کی کوشش کی لیکن وہ بھاگتا
ہی گیا - ہم بھی اس کے تعاقب میں بھاگتے رہے نیلا
آسمان صاف اور دھلا ہوا تھا - اور مغرب کی طرف
ایک پھیکے خلا میں کھسیانا چاند لٹکا ہوا تھا - چاند کی
روشنی زرد اور کچھ مضمحل سی تھی - آسمان پہ موٹے
موٹے روتے ہوئے ستارے تھے - اور زمین پر
پچھلے پہر کی شبنم ______ مدھم مدھم چاندنی میں
دریائے راوی دودھ کی سپید نہر معلوم ہوتی تھی -
وہ بڑھتا گیا - بڑھتا گیا - اس کے پاؤں زخمی
ہو چلے تھے - اس کا انگ انگ دکھ رہا تھا - اب تو دریا
کی طوفانی لہروں کی آوازیں ہمارے کانوں کے دبیز
پردوں سے ٹکرانے لگیں - ہمارے قدم اور تیز ہو
گئے - چاروں طرف نہاں خموشی تھی اور تاریکی ______
فضا ہمارے قدموں کی آواز سے گونج رہی
تھی - ایک لمحہ ہمیں لہروں کے شور میں آواز آتی
"الوداع"
اور پھر چاند چھپ گیا - رات تاریک ہوگئی - ایسی
رات میں، فرہاد کی طرح کسی کے دریا میں کودنے
کی آواز آئی - ہوا اس قدر تیز چل رہی تھی جس سے
معلوم ہوتا تھا - کہ آسمان پر ستاروں کے چراغ
گل ہو جائیں گے - اور کوئی اس دل ہلا دینے والے
واقعہ کو نہیں دیکھ سکے گا ______

مرسلہ منیر احمد فرخ

اپنی پسند!

مختصر یہ ہے ہماری داستانِ زندگی
اک سکونِ دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کئے
(جذبی)

اے چشمِ خشک تیری تقدیر جاگ اٹھی
پھر اٹھ رہی ہیں موجیں دل میں مرے لہو کی
(جذبی)

نظر پھر دشمنوں کو ڈھونڈتی ہے
جفائے دوستاں ہے اور میں ہوں
(آزاد)

بے ثباتیٔ عالم

(فرمودہ عالی حضرت بانی سلسلہ احمدیہ)

اک نہ اک دن پیش ہوگا تو فنا کے سامنے
چل نہیں سکتی کسی کی کچھ قضا کے سامنے

چھوڑنی ہوگی تجھے دنیائے فانی ایکدن
ہر کوئی مجبور ہے حکمِ خدا کے سامنے

مستقل رہنا ہے لازم اے بشر تجھ کو سدا
رنج و غم یاس و الم فکر و بلا کے سامنے

بارگاہِ ایزدی سے تو نہ یوں مایوس ہو
مشکلیں کیا چیز ہیں مشکل کشا کے سامنے

حاجتیں پوری کرینگے کیا تری عاجز بشر
کر بیاں سب حاجتیں حاجت روا کے سامنے

چاہیئے تجھ کو مٹانا قلب سے نقشِ دوئی
سر جھکا بس مالکِ ارض و سما کے سامنے

چاہیئے نفرت بدی سے اور نیکی سے پیار
ایک دن جانا ہے تجھ کو بھی خدا کے سامنے

راستی کے سامنے کب جھوٹ ٹھہلتا ہے بھلا
قدر کیا پتھر کی لعلِ بے بہا کے سامنے

نالہ ہائے سحر

تاثیرِ نالہ ہائے سحر دیکھتے رہے
بجھتے ہوئے شرر پہ شرر دیکھتے رہے

دل سے صدا یہ طور پر آئی کلیم کو
جلوہ کدھر تھا آپ کدھر دیکھتے رہے

آنسو ٹپک کے خاک میں گم ہو گیا کہیں
ہم لرزشِ شعاعِ قمر دیکھتے رہے

لاکھوں تڑپ تڑپ کے نظارے پلٹ گئے
کچھ بھی نہ دیکھتے تھے مگر دیکھتے رہے

تاروں نے اپنی راہیں بدل لی ہیں اور ہم
اُن کے گلے میں لعل و گہر دیکھتے رہے

میخوار آئے جام پیے مست ہو گئے
ہم پیرِ میکدہ کی نظر دیکھتے رہے

وہ آئے مسکرائے ذرا باغ کھل گئے
ہم چرخ پر فغاں کا اثر دیکھتے رہے

تھی ایک جست صاحبِ لولاک کیلئے
جبریل اپنی جنبشِ پر دیکھتے رہے

تنویر اُن سے کیجئے تغافل کا کیا گلہ
ہم ہی اُدھر نہ تھے وہ جدھر دیکھتے رہے

سید ابوالحسن قدسی

سخن با آفتاب

آفتاب اے جلوہ ات عالم فروز
باز آوردی پیام ساز و سوز

آں چناں بزمِ جہاں آراستی
ذرّہ را شمعِ فروزاں ساختی

آتشے سوزاں بدل داری نہاں
یک شرارش دردمے سوزد جہاں

ساطگیں گردانِ بزمِ عالمی
مشعلِ خنداں بزمِ عالمی

لیک از صہبائے نو بیگانہ
مے تواں گفتن نہی پیمانہ

بودۂ از فکرِ فردا بے خبر
در تب و تابِ تمنا بے خبر

طرز و انداز و روایت کہنہ است
لفظ و معنی و روایت کہنہ است

اے گرفتارِ تماشائے کہن
با من از نظارۂ نو کن سخن

با من از دورِ جہانِ نو بگو!
از زمین و آسمانِ نو بگو!

فطرتم با ذوقِ جدت آشنا است
بہرِ صیدِ نو کمندم بے خطا است

جادہ پیمائے طلب اندیشہ ام
نقش ہائے تازہ بستن پیشہ ام

سوز و ساز زندگی را خو گرم
آتش و آب ست اندر ساغرم

شوق اگر داری بیا در محفلم
تا شوی آگاہ از رازِ دلم

خویش را در شعلۂ آہم بسوز
شمعِ دل از آتشِ من بر فروز

محشر از فریادِ ہائم در خروش
نغمہ ام جبریل را فردوس گوش

در خزانم ابرِ آزاری رسید
گرد بادم گلستانہا آفرید

نظمِ من ہیں ماہ و پروینم بدہ
از سرِ خود تاجِ زرّینم بدہ

ارشد ترمذی

غزل

سرودِ بلبل و رنگِ چمن نمیدانم
بہارِ سرو و گل و یاسمن نمیدانم

اسیرِ حلقۂ زُلفِ سیاہِ مہ رویم
گلِ بنفشہ و مشکِ ختن نمیدانم

مثیلِ حُسنِ جہاں تاب آں شہِ خوباں
دریں جہان یکے سیمتن نمیدانم

زہوش رفتم و ہر جا روم بہ سودائیت
سرای و بادیہ و انجمن نمیدانم

بیادِ یارِ طرح دار گفتہ ام غزلے
کہ شیوہ ہائے عروضِ سخن نمیدانم

راجہ نذیر احمد ظفر

غزل

ہزار بار کہی تھی جو بات بھول گئے

دیا تھا ہاتھ میں میرے جو بات بھول گئے

تمہارے دل میں محبت کی آگ کیا ہوگی

کہ تم تو رسم و رہِ التفات بھول گئے

ابھی سے تم ہو گریزاں تو آگے کیا ہوگا

وفا کا عہد جو تھا تا حیات بھول گئے

تمہارے ساتھ محبت کا دم جو بھرتی ہے

بھرے جہاں میں ظفر کی ہے ذات بھول گئے

مظہر قیوم ناز

غزل

مہ و انجم کی محفل میں اگر ساقی مجھے بخشے۔

مئے الفت کا اک ساغر حیاتِ جاوداں ہوگی

فضائے کوئے جاناں کی بہاریں یاد آتی ہیں

گر اس جانب صبا گذرے تمنا پھر جواں ہوگی

مجالِ گفتگو مشکل ادب ان کا ہے مانع

یہاں قرطاس ابیض پر قلم ہی خونچکاں ہوگی

حدیثِ بادہ و گل میں مزہ اتنا کہاں ہوگا

مرے افسانۂ غم کی جہاں کے بیزباں ہوگی

تجھے وہ قتل کر کے ناز سب کی بددعا لینگے

صفِ ماتم بچھے گی ساری دنیا نوحہ خواں ہوگی

اقبال محمد خان

غزل

دستور ہے انکی مجلس کا معمول ہے ان کی محفل کا
جب بات زباں پر آ نہ سکے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہیں

ہم آ تو گئے اس محفل میں اور جامِ محبت تھام لیا
پر وہ تو الفت کی مے کو آنکھوں سے اتارا کرتے ہیں

طوفان میں کشتی آ جائے یا پیار کی منزل کھو بیٹھیں
ہر ایسی مشکل میں آ کر نام ان کا پکارا کرتے ہیں

ہم تو بن کے جوگی ہیں آداب سے ہم نا واقف ہیں
جب پھول صبا سے شرمائے اس وقت نظارہ کرتے ہیں

سعید کاشر

غزل

یہی کیا آپ نے کچھ کم دیا ہے
سکونِ نا آشنا کو غم دیا ہے

جہاں منزل سے جاتی ہیں راہیں
وہاں راہی نے جا کر دم لیا ہے

حسیں پھولوں پہ شبنم ٹک گئی ہے
نگاہِ ناز کو یوں خم دیا ہے

دل آئینہ ہے جس سے دیکھتا ہوں
خدا نے مجھ کو جامِ جم دیا ہے

از قاضی محمد ظہور الدین صاحب اکمل

سلامت میکدہ یارب سلامت پیرِ میخانہ
خدا کے بعد جو کچھ ہے مرا وہ میرِ میخانہ

الٰہی دانۂ انگور میں کیسی کشش رکھ دی
کھچی رہتی ہے میرے واسطے شمشیرِ میخانہ

کہاں تک خانقاہ و مدرسہ میں جستجو میری
کہ بندہ مدتوں سے ہو چکا جاگیرِ میخانہ

کسی کو بے پئے رہنے نہ دیں سب مست ہو جائیں
بڑھاؤ اس طرح سے دوستو توقیرِ میخانہ

چلو تلچھٹ ہی دیدو دو مگر اپنے ہی ہاتھوں سے
نہیں ہو جائے گی کچھ اس طرح تحقیرِ میخانہ

اُداسی ہی اداسی چھائی رہتی ہو جہاں ہر دم
وہاں پر رہتا ہے اکمل ترا دلگیرِ میخانہ

ارشد ترمذی
فائن آرٹس (سال دوم)

غزل

نہ ہو عزیز بھلا کیوں ہمیں غمِ جاناں
جگر کے خون سے یہ درد ہم نے پالا ہے

خرد تو کام نہ آئی کسی بھی مشکل میں
ہر اِک قدم پہ جنوں نے ہمیں سنبھالا ہے

کوئی جلے تو کسی کو سکون ملتا ہے
دیارِ عشق کا دستور ہی نرالا ہے

ہے گرچہ شمع کا جلنا اجل پتنگوں کی
جلے جو شمع تو پھر بزم میں اُجالا ہے

ہر ایک بار بڑھا اور اپنا ذوقِ طلب
اگرچہ اُس نے ہمیں بار بار ٹالا ہے

میں گھر چکا تھا غمِ روزگار میں ارشد
تمہارے لطفِ نظر نے مجھے نکالا ہے

لطف الرحمٰن محمود
بی۔ ایس۔ سی

اہلِ وفا کا شیوۂ تسلیم ہے یہی ورنہ تری جفا کوئی اتنی حسیں نہیں

بستی ہیں کتنی حسرتیں تیرے جوار میں دل کے حسین شہر کا تو ہی مکیں نہیں

کیا ادعائے عشق کو تسلیم کر لیا کیوں آج کل نگاہ تری نکتہ چیں نہیں

حیراں ہوں کس لئے نگہِ نازِ اُداس اپنا دلِ غریب تو اتنا حزیں نہیں

کس چیز سے جلائیں محبت کی مشعلیں مینائے دل میں اب وہ مئے آتشیں نہیں

ڈرتا ہوں میں یہ ٹوٹ نہ جائے کہیں طلسم تیرے غرورِ حسن کا مجھ کو یقیں نہیں

محمود لوگ دیتے ہیں کیوں داد شعر پر
تشہیرِ غم تو قابلِ صد آفریں نہیں

پروفیسر محمد شریف خالد

راتیں

کہوں کیا گزرتی ہیں کیسے یہ راتیں
یہ فرقت کی راتیں ہیں آفت کی راتیں
نہ معلوم تھا ہوگی حالت یہ میری
تڑپتا ہوں جب یاد آتی ہیں باتیں
وہ پُرکیف راتیں یہ بے کیف راتیں
ستم پر ستم یہ نئی وارداتیں
ہوں مجبور و بیکس نہ محمل نہ منزل
لگائی ہیں حرمان و غم نے بھی گھاتیں
ہوں زندانِ غم میں اسیرِ سلاسل
ہیں مبسوط رنج و الم کی قناتیں
ہے پہلو میں تازہ سدا کسک پیہم
یہ خالد کی راتیں ہیں سالوں کی راتیں

راشد چوہدری

ستاروں کے نام

اے حسینانِ چرخ نقش و نگارِ آسماں
عہدِ رفتہ کی اخوت کا ہو تم زندہ نشاں
اے ستارو! ہاں بتا دو کس لئے لرزاں ہو تم
کیوں تمہارے آشیاں پر کوندتی ہیں بجلیاں
درد کس کا مضطرب رکھتا ہے تم کو سر بسر
رات کو سونے نہیں دیتیں تمہیں بیچینیاں
اے ستارو جاگتا ہوں میں کسی کے درد میں
بے زبانی میرا نالہ اور خاموشی فغاں
تم بھی ہو میری طرح اِک درد میں کھوئے ہوئے
شدتِ غم نے تمہاری بند کر دی ہے زباں
چین لینے ہی نہیں دیتا غمِ دوراں مجھے
دید کے قابل ہے اتوں کو مری بیتابیاں

پروفیسر نصیر احمد خاں

دِل سا دیوانہ کسی دشت و بیاباں میں نہیں
شورشِ قطرۂ خوں بحر کے طوفاں میں نہیں

کس گُل اندام سے لی تُو نے چُرا بادِ صبا
ایسی خوشبو کہ کسی سُنبل و ریحاں میں نہیں

بارے آرام سے ہوں بعدِ فنا یعنی اب
نوکِ شمشیرِ الم میری رگِ جاں میں نہیں

محملِ حُسن سے آتی ہے صدا میرے بعد
کوئی دیوانہ محبت کے بیاباں میں نہیں

غمِ عقبیٰ، غمِ جاناں، غمِ ہستی ہر دم
خار ہی خار ہیں اک پھول گلستاں میں نہیں

بولتا ہنستا ابھی آپ نے دیکھا تھا نصیرؔ
جانے اس وقت وہ کیوں محفلِ رنداں میں نہیں

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE

RABWAH.

Jan., Feb., March,

1962.

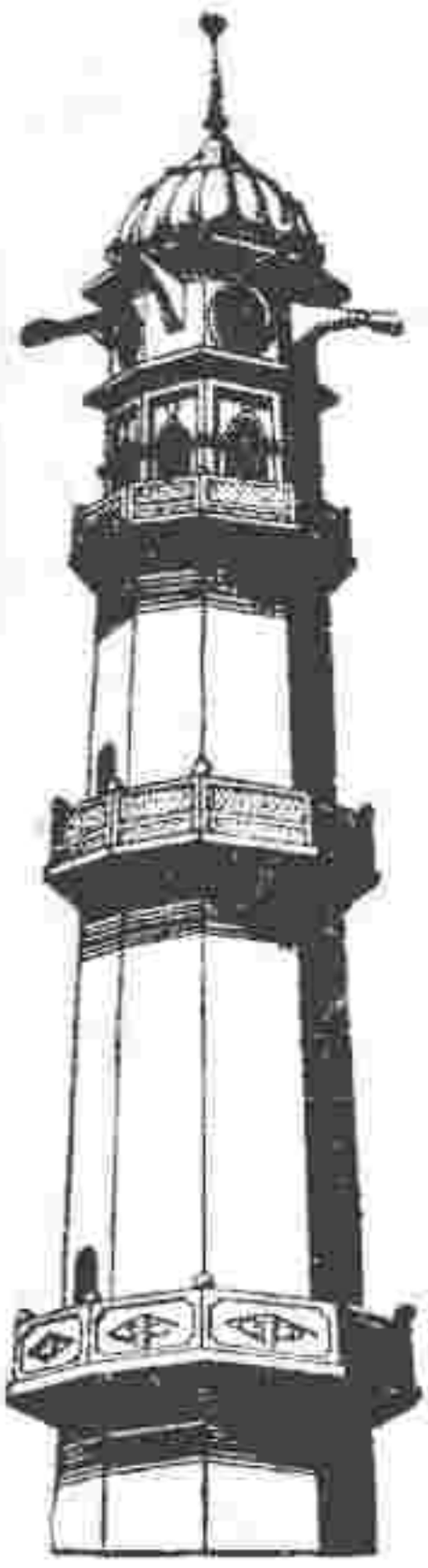

AL-MANAR

TALIM-UL-ISLAM COLLEGE
RABWAH

★

Jan., Feb., March,
1962.

Editors

IJAZUL HAQ QURESHI
FAZAL AHMAD
NASEER TAHIR

We place on record our deep sense of grief and loss at the sad demise of Hazrat Sahibzada Mirza Sharif Ahmad, the youngest son of the Promised Messiah (on him be peace). His death removes from our midst one of the greatest men of this age. His services to the cause of Islam, his dedication to duty, his judgement and erudition, his exalted spiritual attainments, his humility, his simple address and carriage at once singled him out as a man apart. Not only the 'Ahmadiyya Jamaat' but also the world is the poorer by his loss.

We express heartfelt sympathies to Syedna Hazrat Amir-ul-Momineen, members of the bereaved family and all concerned and pray that God grant us all the strength to bear this loss with resignation and courage. May God shower His choicest of blessing on his soul!

Contents

S. No.		Pages
1.	Editorial	... 1
2.	Live and Let Live *Naseer Tahir*	... 3
3.	Importance of History *Ijazul Haq Qureshi (B.A., Hons.) Part II*	... 7
4.	Science in Service of Man *Munir Ahmad, B.Sc. Part I*	... 10
5.	Through the Hills *Noor Mohammad Chandia*	... 12
6.	Veil. *Lutfur Rahman Mahmood*	... 16
7.	Islamic Ethics *Qureshi Ijazul Haq, B.A., Hons. Part II*	... 17
8.	How to Dig a Gold Mine *Hasan Mohammad Khan Arif,* *Naib Vakilul Tabshir, Rabwah.*	... 19
9.	The Paradox of Blood *Khalil Ahmad XII*	... 21
10.	The Beard that Failed *Mahmood Sultan XII*	... 23
11.	Sex and Social Construction *Naseer Tahir XII*	... 25
12.	Star and Key of the Indian Ocean *Hussan Mustun XII*	... 27

Printed at the Nusrat Art Press, Rabwah.

AL-MANAR

Talimul Islam College, Rabwah.

Vol. XI	Jan., Feb., March (1962)	No. 4,

Editorial

Almanar is at last in your hands; but we reiterate our long standing complaint against the students who do not co-operate with their magazine. 'Almanar' is your own, and let it be clear to everyone that if the present indifference of students towards it continues, its survival may become doubtful, not to speak of raising up its standard. It is the magazine of the students and we want them to make it their own. Some of the students do not write because they 'don't have time'. Strangely enough, they consider it, perhaps, a wastage of time to write something for the magazine. We would like to inform them that its not so. In addition to the service that they render to their institution by writing for the organ of their college they perpetuate their name and improve their expression which helps them in so many ways. Others say they "cannot write". This is another lame excuse because everybody can THINK and one who can think should be able to express his ideas, and this expression is what we need. May be, some of our friends fail in their first attempt to give a proper ex-

pression to their thought but that can be corrected and they can, by practice, improve.

Therefore, what is needed is a little attention and the will to write. Let us hope that our friends will no more deprive us of their long sought co-operation, and the standard of 'Almanar' will be raised up to the ideal mark.

This time we announced an essay competition for the magazine, but we regret to say that very few essays were received. Anyhow, Mr. Naseer Ahmad Tahir's article has been judged to be the best and is included in this issue.

We are thankful to all our contributors and hope that they will continue to co-operate with ALMANAR.

—: o :—

Naseer Tahir

Live and Let Live

While reading a newspaper just a few days ago, my eyes suffused with tears at the dreadful news—'an official commits suicide in Lahore'. My tears might be symbolising sympathy, but I wished them to be a symbol of sorrow. Let us see why. Is it not because the man did not realize the value of the divine gift of life that he found it easier to die? If it is so, and it is, then should we not express our sorrow first and then sympathy? Sorrow because the man was a pessimist.

God has created an endless universe, and it is just for the benefit of the living-beings that the non-living things are controlled by the laws of nature, the laws that we call as the 'scientific laws'. Thus life gives us a superiority to lifeless things. But we have another claim too. It is said with legitimate pride that the human-being is the best of all the creatures. Then, should we degrade life? Should we degrade what elevates us and gives us eminence? No! it is a folly to do so, and in that case, we are not the best.

'First deserve then desire.' If we claim the highest rank in the creatures, then we are to be optimistic first. We are to live with a real sense of life, and so let us take the caution of living spiritually as well as physically. If our soul is dead, our physical life is of no use. If our spirit is slumbering it brings no use to us whether we keep our protoplasm alive or let it die; because it is the active soul that represents real life. Then live with a living soul within you. Do not think that life is an empty dream, because dead souls think it so. Don't be so dejected as to say that life is a prepposterous work of God, and a meaningless possession of the humanbeing, because it is the dull spirit that says so. Life is something real, and truly alive is he who comprehends its reality. There are so many divine gifts that we have received, and life is the best of them in its grandeur and glory. Then why not avail ourselves of this richest gift of the generous nature? And that is what the caption suggests in its first essential part. Live, be up and doing, particip-

ate in the struggle for existence optimistically, and go on striving with a hope for success. Life is a tedious voyage, but only for those who don't take interest in it. To others it appears as graceful as the tedious game of cricket appears to its fans. Life is lifeless only to those who are spiritless, having no ambitions at all. For an enterprising soul and for an active spirit the pitch dark night is as full of life as the bright shining day. Where there is success there is life, and where there is failure, there is death. This is a frivolous, pessimistic view of life. Let us bury this idea and be sure that where there is life there is success; and where there is a failure there is a challenge to our living soul. This challenge must be met with patiently and courageously. Then you will see how delightfully your living soul brings success to you. Don't let the katabolic despondency and dejection influence you defiantly. If you are chapfallen while in troubles, you are no longer alive. But if you rise to the occasion, suppress down all the negations that rise against your soul, and face all the troubles that thwart your way towards the sacred and sublime aim of your life, with smiling countenance, your soul is sure to achieve an eternal life. Life is a vast ocean with sudden ebbs and flows; and we are to adapt ourselves to these changes instead of leaving ourselves on their mercy. Steer up your ship in the billowy ocean of life courageously. Shipwrecks should not put an end to our efforts; and be sure, if ourefforts are not exhausted, we will reach our destination—a destination where crowns await us, where divine blessings seek us, and where we are to be entertained with the nectar of eternal satisfaction. Don't stoop to the frowns of time. Square up to your quandaries and engender a spirit that laughs away all the troubles. This is how you are to live. Life is bleak, if it is taken to be so. But there is nothing more interesting than life if we take interest in it.

Now let us see what allowed the man to commit suicide. I am sure he lacked the fundamental virtue upon which the architecture of life depends. And that virtue is our sound conception of life itself. Poor fellow! He failed to avoid negative thoughts. Shades of horror influenced him and he could not realize their falsity. Dark, pitch dark, dreary, desolate, dull; this is what he took life for. So let me admonish you my dear men, not to be so angry with life, as to get rid of it. Come

forward to embrace life. Live, and live with ambitions, desires, hopes, efforts and with all that is positive and constructive.

Then we take up the other complementary phase without which the philosophy of 'live' is incomplete. Fortunately we top the order in which the members of the whole animal kingdom have been arranged. Now the noble society that we, the Homo sapiens have established cannot be maintained peacefully unless we observe the virtuous principle, i. e., live and let live. The advice 'let live' exhorts us to modify our general behaviour towards our fellow-beings, in a balanced and harmonious way. No doubt, liberty is the ornament of individuality, still humanity appeals to us not to be so selfish, as to neglect others while rejoicing our liberty. We must be within limits and take others into consideration, too. As a matter of fact, it is mutual co-operation, mutual reverence and mutual regard that strengthens our integrity. The gentle society of human race is sure to perish away, if there is any negation to this general rule. Give and take, protect others and be protected, help others and be helped, respect others and be respected. These are the only lines that establish a bond of maintenance between two individuals. The scientific observations like commensalism and symbiosis are simple forms of this vital rule, teaching us a great lesson. The solid examples quoted above cannot allow a word in contradiction to the fact that for your living it is essential that you let others live, and for your maintenance it is necessary that you help others in their maintenance. So, remember that merely the two hands and one mind that you possess cannot help you in handling your affairs satisfactorily. For them you require a helping hand from others. And it is not the case with you only, because others also need and seek your help. So, this inevitable circle of give and take is the basic factor in the process through which oneman is linked to another man. Then how to maintain this link is a simple but a lengthy affair. You are to harmonize your activities so that they don't harm others. You are to extend a balanced bahaviour towards your fellow-beings, so that it produces no deflection.

There are people, shipwrecked, afflicted and disgusted with life. Now it becomes to you as a moral duty, an honourable one, that you give them a new spirit of revival. Don't discourage them, because it brings death to them. Let them live and give them life through the most noble intellect from which you are

receiving the dazzling rays of optimism. Keep the banner of the gospel of life upright, so that desperate people may seek protection under it.

In the noble theory of 'let live', the most systematic and paying factor is to abide by the laws and regulations of society voluntarily. Realize the worth of the principles of society and act accordingly. It is justice that assures the safety of every one of us, and observing principles of society assure justice towards us. Thus to let others live, usurpers are to be suppressed, tyrants are to be frustrated and ignobles are to be thrashed. Be determined to serve humanity, and help others to create a pleasant and fraternal atmosphere in society. Engender the virtuous sense of philanthropy, and be sure that what you do good for others, you do better for yourself. This constitutes a pleasant cycle in which one is a donor and an acceptor at the same time. Eventually, a man is complementary to another man; and his life is invariably linked with the lives of those who are around him.

Ijazul Haq Qureshi, B.A., Hons. Part II

Importance of History

"If you want to destroy a nation, destroy its history", says Sir Syed. It goes without saying that national history is the strongest incentive in creation of heroic character ; it can create love and devotion to one's country and thus by bringing awakening metamorphosis it can raise its dignity and prestige to astounding heights. On the contrary, to put the chivalrous deeds of the past into oblivion or to content oneself with wrong historical events can prove a death-blow to the civilization of a nation and can be nothing but an addition to the indolence of its youth. This is why the domineering races scarcely take pains in preserving the history of their subjects ; they always endeavour to darken the glorious past of the subjugated races so that they may be deprived of their glorious traditions or at least their keen interest in their history may suffer a serious setback. With this in mind, the chroniclers of the monarchs in power either by-pass the achievements of the ruled or distort the face of events and facts in such a way that the reader, having got wrong impressions, develops hatred and contempt. The next result of this extinction of inspiration from the past history is that the youth lose self-realization and dare not stimulate any freedom movement.

The impartial historical records depicting the ascendency of a nation are the indispensable ingredients which go a long way in re-establishing its vanished power and restorting its past glory For instance, Shivaji got inspiration from past glories of the Hindus and was able to carve out an empire in Maharashtra. On the contrary, Mughal rule did not take its roots in the Indian soil because it failed to evoke "such feelings as those which led people of Mahrashtra to follow and fight for Shivaji, it drew no strength from ancient tradition which has always exerted so marked an influence upon Hindu ideals and sentiments." Thus we see that ancient history is a factor of prime importance and the chief source of strength for a

country. If the Muslims come to realize the significance of the marvellous achievements of their ancestors and assimilate their good characteristics, even today they can render meritorious services to the cause of Islam.

The lives of great men in the past can serve as flambeau for our life ; we can do wonders by following their suit as Longfellow says :

Lives of greatmen all remind us
We can make our lives sublime,
And, departing, leave behind us
Footprints on the sands of time.

When we read the life of a greatman it is not so much to honour his memory as to get inspiration for living. We think that great men were in every better way than we, and yet they suffered far more than we do. No human attainment is cheap, least of all greatness in any walk of life. Greatness has its price and the price of greatness is always pain. Well has it been said, "No gain without pain". Since these men suffered so much, what do our petty annoyances and dejections matter ?

"What evil luck so-ever
For me remains in store,
It's sure much finer follows
Have fared much worse before."

The study of history makes a man a convinced cosmopolitan, like Goethe who said "Above all nations is humanity." We come to realize that mankind is one, and lose much of our Pride in Nationalism. By the study of history we get cured of that intellectual myopia which sings the praises of a single race or nation. Even the greatest of men in the past have suffered from this intellectual myopia. Guizote wrote : "To France, therefore, must be ascribed the honour, that her civilization has reproduced more faithfully than any other general type and fundamental idea of civilization." A Hindu has dedicated his book, entitled "Hindu Superiority," to "India paradise on earth, that gave civilization and religion to the world : Eternal, Immortal, Everlasting". The cure for all such kind of lunacy is the study of history.

History makes men tolerant. We learn to judge all persons by the standards of their age and environment, and not by the ideals of our own age.

History proves the inter-dependence of nations and races, provided it is complete. Some historians see in political or social relationship a series of conflict between groups by which power passes from one to another. Other historians exp-

lain events economically instead of politically. In both of these cases the resulting picture of man's past is incomplete. Prof. Gilbert Highet says that social and political groups are related to one another as pupils and teachers. So if the history of the world is written as a history of the movement of ideas from one group to another, it can strengthen the international bonds of amity and goodwill. For instance, the Chinese and the Hindus borrowed ideas from each other. The Muslims, before they became the teachers of Europe, were the pupils of Greece. Modern European civilization is built upon legacies left to it by Greece, Rome and Islam. So a reader of history showing mutual relatonship can proudly see eye to eye with Ference, the Great Roman historian, who said, "I am a man and nothing that relates to Man is alien to me."

The study of history fires us with enthusiasm for reforms. History proves that all nations and races have progressed by eliminating evils irom society as far as they could. We are convinced that all elements of good and permanent value in the old system must be maintained, no matter what race and nation evolved them. We also realize the indispensibility of overhauling old systems at intervals to suit the needs of the changing times. History makes us realize that "we must destroy in order to build." Whittier has put it beautifully :

"I looked aside the dust cloud ;
The waster seemed the builder too;
Up springing from the ruined old
I saw the new.
It was but the ruin of the bud,
The washing of the wrong and ill,
Whate'er of good the old time had
was living still."

Man's growth from barbarism to civilization is the theme of history. It shows us how the idea of mutual co-operation has evolved and our idea ought to be to work for the benefit of man-in-the-street. History denounces invasions for personal aggrandizement or lust of power and proves that 'peace hath her victories no less renowned than war.'

Consequently, it can inculcate a spirit of peace and tranquillity in the minds of human-beings—a long cherished object.

To sum up, history is like a lighthouse in a dark ocean ; it helps in smooth sailing of the man's ship of life ; it is the saviour of mankind when faced with head-breaking and baffling problems ; it is the safe anchor to which man seeks shelter when defeated in grim struggle for existence—it is here that he learns invaluable lessons.

Munir Ahmad B.Sc., Part I

Science in Service of Man

By its wonderful achievements Science has so reduced the margin of impossibility that we are ready to believe anything and everything adout science today. It has given our age a firm conviction, fervent hope, and full confidence in man's intellectual powers. The comforts of life have been increased, unsurmountable barriers have been broken down, the bounds of human knowledge have been extended, and science has conquered for us even the air, and the sea. Thus, the goddess of Science has blessed us with both hands, and it is up to us whether we use these blessings for our betterment or for our destruction.

The blessings of science in our daily life are innumberable. It has brought so many comforts in life that the modern man has virtually become its slave. It has, in Macaulay's words "lengthened life and mitigated distance". It has extended man's range of hearing and sight. The dream of man's conquest of nature has been realized day after day. Today he can move much faster than his legs can carry him. Railway trains, steam ships, and aeroplanes have brought him mastery over land, see and air. The discovery of steam power and electricity has worked wonders in all walks of life. Science has multiplied the wealth of nations to a considerable extent, and the common man is richer than he was at any time in human history.

Centuries ago, man dared believe that the earth was round and he sailed off in frail boats across unknown seas. Crossing rivers, mountains, deserts, he explored and circled the globe. Then he invented aircrafts, and today he experiments with rockets which may take him to the moon. With the aid of powerful telescopes, he has learned much about the solar system and a great deal of what lies beyond it.

And so, through the centuries, curiosity has led to discovery—and discovery usually has been good for man, although it may not al-

ways seem so at first. When cavemen first discovered fire, it must have seemed as wild as an untamed animal. Fire brought fear and danger ; they did not know how to start it, what would burn or how to put it out ! When man understood how to control it, fire brought us warmth, better food, and the power that comes from steam.

During the Middle Ages, alchemists, often goaded or rewarded by nobles and kings, worked feverishly trying to find out a way to turn baser metals into gold. Although they were not successful, their untired experiments helped form the basis for the science of chemistry which was essential to atomic discoveries. The trial to the heart of the atom has been long and has wound through many countries. Many a man, groping ahead towards what he believed was true, has made his contribution to what we know. Let us meet a few of them.

In the 17th Century, an English Scientist Sir Issac Newton, came to believe that light rays are small atom-like particles flowing away from a source of light.

In the 18th Century, the Italian Physicist Alessandro Volta discovered that an electric current can decompose certain molecules, or cluster of atoms, into their component substances.

In the 19th Century, John Dalton discovered that chemical elements always combine, in definite proportions by weight. He concluded from this that they must be made up of tiny particles and that all particles of one element are exactly alike.

In the 20th Century, the great genius Albert Einstein showed in 1905 that mass can be converted into energy and vice versa. This famous mathematical formula was $E=mc^2$ which means energy equals mass multiplied by C^2 (where C is the velocity of light, which is 186, 324 miles per second). The formula thus showed that a very little mass could be converted into a vast amount of energy and gave scientists a hint of the tremendous power that was stored in the atom.

Unfortunately, the progress of science is leading the world towards scepticism and atheism, and man's belief in God is shaking. Under these circumstances, it is our responsiblity to reaffirm our faith in God and prove His existence by scientific arguments. Therefore our youngmen should learn science and try

to be good scientists so that they may tell the world that everything reveals God and confirms our faith.

How should a youngman prepare to become a scientist ?

First, he should take all the mathematics, Physics, Chemistry, and biology courses that his school offers and all the readings on these subjects. Good scientists show curiosity. To question is to learn. One successful scientist names seven qualities that any youngman must have or cultivate—if he is to make science study his career.

He must have imagination.

He must have a deep-rooted desire to understand the what and how and why of things.

He must have patience, for as a scientist has said : "The only time you don't want to fail is the last time you try."

He must be interested in Mathematics.

He must enjoy hard work.

He must have the ability to collect data, to find facts and analyse them.

He must be a non-conformist, must be willing to stay from the usual mental paths and think for himself.

For supplying us with so many blessings, for curing our maladies, for shortening distances, and for lifting up the veil of mystery from the face of nature, for all these blessings we are obliged to science. But the tale does not end here. It is at once both, the preserver and the destroyer of humanity.

The invention of dangerous weapons like the atom and the hydrogen bomb has created a bitter prospect of war. Thus we must approach to the scientific problems with a view to attaining peace and prosperity out of them.

Qureshi Ijazul Haq, B.A., Hons., Part II

ISLAMIC ETHICS

By ethics we mean reciprocal privileges and duties, the execution of which is incumbent upon all. Ethics plays an important role in the elevation of character. Islam has put a great emphasis on ethics because it's the prerequisite of all virtues. The Gracious God addresses the Muslims thus :

'Verily, Allah enjoins justice, and the doing of good to others ; and giving like kindred ; and forbids indecency, and manifest evil, and wrongful transgression. He admonishes you that you may take heed. (16:91)

The very object of the Holy Prophet's mission was the perfection of morals as he hath said : 'undoubtedly, I am sent to perfect the good morals' Allah, the All-Knowing, corroborates the virtues of His prophet in these words :

'And thou dost surely possess high moral excellences' (68:5)

But for the acquisition of good moral man can't attain spiritual progress. It is due to this fact that the Holy Prophet (peace and blessings of God be upon him!) has enjoined on us to manifest in ourselves the divine attributes. The more a man adopts divine attributes, the more beloved of God he becomes.

The land-mark of human progress is the attainment of spiritual elevation.

Good ethics is also inherent in Islamic beliefs and forms of worship.

Prayer, saves us from indecencies as the Holy Quran Says :

'Surely, Prayer restrains one from indecency and manifest evil, and remembrance of Allah is indeed a great virtue (29-46)

Zakat teaches us to sympathise particularly with the poor and the indigent. Fast is another way of acquiring moral excellence.

There is another decree of the Holy Prophet in Bokhari : 'The best

among you is he who possesses good morals'. 'The chastisement of evil ways, the Prophet said, is that an immoral man shall not go to heavens' (Trimazi).

The elaborate commands of the Holy Prophet pertaining to ethics are as under :-

1. 'The scale of good morals on the day of judgement will be the heaviest. The possessor of good morals can attain the degree of a man who says prayers and observes fast. (Tirmazi.)

2. The best among the bounties which God has bestowed upon people is good ethics (Nisai).

3. Hazrat Jabir relates that the Holy Prophet said: 'The nearest man to me on the day of resurrection will be he whose morals are the best of all.'
(Tirmazi)

4. Hazrat Abu Dardau relates that the Prophet of God said: 'There is nothing heavier in the scale of actions than good morals'
(Abu David)

5. 'No greatness and manliness is equal to good morals' (Ibni-Maja)

6. On being asked as to what was the easiest way to heaven, the Holy Prophet responded: 'fear of God and good morals'. (Ibni Maja)

7. Similarly Abu Hurairah relates that the Holy Prophet said: 'He who has faith in God and the day of resurrection should say good things or otherwise remain reticent' (Bokhari)

The Holy Prophet always prayed to God: "O God! lead me thou to the best path of morals because but for Thee no one can guide us to higher morals." (Muslim)
Similarly he prayed:

"O Gracious God! Thou hast made my countenance good, make my character also good" (Musnad Imam Ahmad)

From the facts, aforesaid, it is crystal clear that the acquisition of good ethics is indispensable for man's material and spiritual progress we shoud therefore make up our minds to leave no stone unturned in assimilating good morals and evade, as far as possible, impurities of this ephemeral world. More ver, we should make it a point to disseminate these virtues in our colleagues and compeers so that the wold may become a veritable place to live in.

H. M. Khan Arif, Naib Vakilul Tabshir

How to Dig a Gold Mine

(We are thankful to Mr. Arif for the nice piece of advice that he has given through this article. Our students can dig gold out of it, provided they read it with a willingness to act upon and not to forget).

People who own gold mines are rich. They dig gold out of them which provides them with wealth. We don't have gold mines in every country, in every town and in every village, but you find rich men every where. So it is not a gold mine alone which makes one rich but there are other factors too wich bring prosperiy.

Wealth brings you comforts - even luxuries of life. Try to have them but without violating the rights of others. But if you swindle others, cheat your fellow workers, usurp that whic his not yours, be sure you will never be happy even with gold and silver.

You also can be rich, can amass wealth in abundance, provided you know how to dig the mine where it lies hidden for you.

People have gathered riches in many ways. But one of the surest ways is to work hard. Whatever the profession, hard worker leads the rest. Look at the field of a hard working farmer. It will be greener than others. At the time of harvest, it will be thicker than the next field. Its fruits and produce will bring much more wealth to its hard working owner than other slow goers.

Have a talk with an industrious merchant. If he has opened his shop recently, he will be increasing his customers slowly but surely. His sales will be mounting by and by. He comes early in the morning—earlier than others. He goes late at night—later than others. Keeps his shops clean and tidy. He works hard at his accounts. He is not lazy to keep his shop, shabby. People start liking him soon. Once a customer visits his shop, he will try hard, very hard, to please him so that his visit is repeated. He tries to acquaint himself with business methods by reading useful books on business which enlighten his brain. Gradually but surely he peeps high above others.

This makes other shopkeepers stare at him. Some are jealous and some envious but he plods on to the pinnacle of glory and riches. And one day he is the master of a gold mine which brings him wealth and provides him with comforts of life—even luxuries.

Go to an office. See the workers buried in heaps of files and papers. It is an interesting scene. But if you look closely you will find some loiterers. Some of them will be whiling away their time in gossiping, some reading newspapers and some merely basking in the sun. Although he does not have very large amount of work, yet he feels he is over-worked. Honest and diligent worker has no time to spare. If he has finished his own job, he tries to find more work to do. He will help his colleagues in their arduous jobs. He comes five minutes earlier than the office opens. At closing time he is not very eager to quit. He finishes the case in hand calmly and then wind's up his work. He is alert at the officer's call. He presents himself before him not sluggishly. He carrieas out the orders of his boss to the finest detail. He works hard on all sides.

Do you know the result ?

It is a happy surprise. When the time of promotion comes, this Mr. Toiler supersedes Mr. Sun-Basker and Mr. Sweet Chatter. They have missed the bus of Promotion because they were basking in the sun or deeply absorbed in chatting aside the road to Honour. This Mr. Toiler worked hard and keenly waited for The Promotion Bus. When it arrived, he missed no time to board it.

You are a youngboy. The whole life is a great adventure before you. Books are your picks and shovels to dig the mine which has preserved gold for you. Dig it deed, Dig it heard The lumps of gold are not far to seek. Mind that genius is not a born genius. Genius is one who can work harder than the hard worker. Thomas Edison, the great American inventor said once, "Genius is one percent inspiration and ninety percent perspiration." Jane E. Hopkins remarked, "Gift, like genius, I often think means only an infinite capacity for taking pains."

Work harder than the hard worker. You also will be a genius Your examinations are running at galloping speed. They will overtake you in no time. Be prepared and well prepared to meet Mr. Exam. He is a stern task master. Let me tell you a secret. Every examiner

(Continued on page 22)

Khalil Ahmad XII

The Paradox of Blood

Our blood is a complex fluid containing different kinds of cells and scores of substances and catalysts. Blood is a colourless fluid in which a large number of cells, the blood-corpuscles, are floating. These cells are of two types red and white cells. The red blood-corpuscles are circular biconcave and non-nucleated. They contain an important complex iron-bearing compound called haemoglobin. In the lungs haemoglobin readily combines with oxygen to form a loose compound known as oxy haemoglobin which as readily gives up its oxygen in the capillaries of the tissues. Thus haemoglobin serves as a carrier of Oxygen. The white blood corpuscles or leucocytes are larger than the red cells and are much less in number. They are quite colourless and granular in form, each containing a nucleus. Leucocytes constantly change their shape by projecting their finger like processes called pseudopodia on one side and withdrawing them from the other sides. These movements are known as amoeboid movements because these resemble the minute protozoon (single called animal) known as Amoeba. Leucocytes engulf any harmful bacteria which gain entry into the blood. Generally they secrete certain chemicals which kill the bacteria and neutralise the poisons produced by them.

For most of us, blood, the vital fluid is the fear fluid. Yet blood is a wonderful substance. Blood carries Oxygen, food, germ fighters and chemical messengers to the remotest parts of our body. It brings back carbon dioxide and other wastes so that we can get rid of them.

Blood has the special ability to co-agulate—*to* form clots. Our blood easily flows through 10,000 capillaries. But whenever the skin is cut or a vessel is broken the same blood plugs the wound with a tough elastic seal to keep the germs out and the blood in.

This is the clot, the Nature's original quick hardening plastic.

Suppose a man cuts his finger, a half dozen chemicals unite to

form thromboplastin. At the same time an inactive substance known as prothrombin is changed to the active thrombin. Thrombin arranges itself round the wound and the thromboplastin forms a network over it. The corpuscles are entangled in the network and a dense mass or clot is formed. Thus the Nature's grand and mysterious wall stops the further loss of his blood.

Our blood has still many functions to perform. It distributes the food from the alimentary canal to all parts of the body and carries the waste products of katabolism such as corbon dioxide and urea to the excretory organs, the lungs, the kidneys and the skin which expel them to the outside. Blood regulates the temperature of our body. Inspite of the changes in climate, the temperature of our blood remains almost constant at about 98.6 F.

(Continued from page 20)

will promote only him who deserves. But you don't deserve a mere success. Deserve brialliant success. This can only be achieved under stress of labour. But what lies beneath this giant rock of Hard Work.

Probably—A scholarship.
Certainly—Respect of your teachers.
Surely—Love from your dad and mum.

Mahmood Sultan XII

The Beard that Failed

CHARACTERS :

Philips : a young boy of thirteen

Joan : his sister aged eleven.

Uncle Miachel : Their uncle, a young man.

Aunt Hepzibah : A woman who is quite old Popularly known as the Dragon.

General : Any youngman.

Scene : Philips is playing with his clockwork trains while his sister Joan is looking on :

Philips : I feel very dreary now a days. Even though I am the king the Dragon never lets me out of the house.

Joan : She really is a very mean woman and it was only due to her scoldings that uncle Miachel decided to go to Africa.

Philips : Poor uncle ! He abdicated his throne and now probably he has been eaten up by some lion. We used to have such wonderful times together.

Joan : Yes ! But now all the time we have to act as babies and play with these trains.

Philips : Well never mind, I have a match tomorrow and I will jolly well enjoy it.

Joan : The Dragon won't let you go.

Philips : I am tired of this Dragon, after all I am supposed to be the king. Come on, let us play prank on the servants. I will fill my water pistol, and stand behind the door, you ring the bell and when some servant answers it I will fire the pistol on him.

Joan : Yes, it's a fine idea.

(*Philip fills his water pistol and stands behind the door. Joan rings the bell. Footsteps are heard and the door opens*).

Philips: Fire! (and fires his gun. But a mistake has been made as the caller is not a servant but a General).

General : Achoo ! (He then sees that the person who has fired is in reality Philips, the King. He bows.)

General : Your Highness ! What has happened.

(*Before Philips can reply their aunt Hepzibah hearing all the commotion comes. When she sees what has happened she becomes very angry)*

Aunt Hepzibah : O' you mean boy! what a wicked pank to play on the poor old General. I shall punish you for this.

Philips : But Aunty, it was all a mistake. (and both Philips and Joan start laughing)

General : Yes madam, it was just a misunderstanding of Achoo!

Aunt Hepzibah ! O' you have caught a bad cold, you should go straight home.

(*The General murmuring goes away*) *Aunt Hepzibah matches the water pistol and goes away*)

Philips : Now what can we do sitting here. (Muttering he goes to some others room)

(*Suddenly Joan comes running*)

Joan : O' I have such wonderful news, you would hardly believe it

Philips : Has the Dragon been killed or is going away for a long time.

Joan : No ! But uncl Miachel has come back.

Philips : What! But was'nt he eaten up by a lion?

Joan : No! But he is a different man now-a-days, for one thing he has grown a beard. He is sitting in the next room and wants to see you (*Philips hastily goes there and sees a man with a sunburnt face and a large bushy beard. Joan follows him*)

Philips : Who are you ? I came to see my Uncle.

Joan : Won't you recognise him, he is uncle Miachel.

Uncle Miachel : Hallow boy! I see you are wearing my crown. How is the Dragon nowadays?

Philips : O' Uncle, weare very bored The Dragon won't let us do any thing and she is always scolding us.

Uncle Miachel : Well never mind, now I am back and we will soon set her right.

Joan : Philips, now you will have to give up the crown.

Philips : Never mind.

(*They all laugh and feel happy*)

Uncle Miachel : Philips, give me a cigar, it is a long time since I smoked one.

Philips : Here Uncle (*and hands hiw a cigar and a match box. Both Joan ahd Philips go to another room. Suddenly they hear a shout and dash to the room where their uncle is staying and are amazed to see that half of his beard has been burnt away*)

Philips : O' Uncle, what has happened,. It seems as if you have set fire to your-self.

Uncle Miachel : It's been such a long time since I smoked a cigar and I forgot that I had grown a

(*Continued on page 26*)

Naseer Tahir XII

Sex & Social Construction

It seems paradoxical if someone endeavours to know what definite position he occupies in the vast human society that lies around him. Still misty does it appear whether he occupies any or not. Let us examine the complicated society step by step, and come to some conclusion about our own position.

Every indivdual among us comes of a certain family, however big or small it may be. This is one stratum or the first one from below upwards. Various families, by extending social relation to one another establish a group, a tribe or a nation. And this human society is nothing but an aggregation of various nations. Thus we conclude that every individual among us is a basic unit, not merely of his family or his nation but of the universal Homo sapien society. Likewise is concerned, through an indirect channel, our individual behaviour with the maintenance of this society. This behaviour may concern any factor; and for the present I select a fundamental factor—the factor of sex.

Sex has always been invariably linked to the history of nations, irrespective of their region or era. To explain this influence of sex, we see that it is always morality that determines the fate of a nation. And the moral standard of a nation depends, for the most part, on the conception of sex comprehended by its individuals. Social ups and downs in history fluctuate with the health of this conception; and so it is that a great lesson is taught to us. What we need for a healthy social and national construction is a healthy conception of sex.

Sex, as a matter of fact, is a set of characters that distinguishes males of a species from its females or vice versa. But its scope is not confined merely to this distinction or the resultant physical intercourse. It includes its psychological aspects and philosophical problems as well. This philosophy, in its good health, may

help us for self-construction as well as for social construction. Similarly, misconception of sex or our katabolic behaviour towards it will surely prove fatal. Unluckily, our considerations regarding this basic problem have been very cold and careless. Consequently, we are ashmed of our staggering morality. Generally, in our country, the innocent minds, instead of being trained and acquainted properly, are cruelly over-awed by the term 'sin', transmitted to us by our careless elders. Finally, what happens is that most of us, being seduced by the false attraction of this forbidden fruit, assume a fatal way. Under the influence of the term 'sin', but forced by a curiosity, we appease our thirst secretly. And this brings a wreck to our character.

Our religion, Islam, presents a very suitable and healhty conception of sex, which is quit comrehensive and well comprensible. The regular legel engagement of a woman to a man, termed as marriage, is the most prominent and wisest urge from this religion. If our society is true to the dignity of this bond, and its complementry requirmens are responded wisely, there is no reason why not to be capable of a sublime architecture of our society. Allowance of tetragamy with a condition of our ability to handle the affairs, and other similar suggestions, quite harmonised and balanced in thier effects can lead us to the reformation and construction of our society, giving us a healthy conception of sex

In these last humble words I would like to convey my earnest suggestion to the youth of my nation. All theories, however sublime their wording may be, are practically useless, unless those for whom the theories or suggestions are forwarded, respond actively. Youths are the pillars of a nation. They must keep on their struggle against their false emotions, which particularly at this age, are pressed hard by blind sex.

(*Continued from page 24*)

beard and applied the match here. O' what should I do, it took such a long time to grow a beard like this.

(*Both Philips and Joan burst inth laughthr on seeing his funny face*)

Uncle Miachel : You wouldn't think it so funny if it had happened to you. (*He starts towards the window*),

Philips : Uncle where are you going.

Uncle Miachel : Back to Africa to grow a new beard.

(*The curtain falls*)

Husson Mustun XII Class

Star and Key of Indian Ocean

Star and key of the Indian Ocean is the name given to Mauritius due to its fame and important position in the Indian Ocean. I believe that most of the readers of Al-Manar do not have the least idea about Mauritius—that pearl of the Indian Ocean. It is the purpose of this article to introduce Mauritius and to provide the reader a broad view of that country and her people.

In the Western Indian Ocean just within the Tropic of Capricorn, about 1,500 miles from the east coast of Africa lies Mauritius. Approximately 40 miles long and 30 miles wide, its area is 720 square miles and it is encircled by coral reef and blue green water. In the centre a great plateau rises to a level of some 1,900 feet. Bordering the central tableland are three mountain ranges with fantastically shaped masses of basalt which testify to the volcanic origin of the island. From these mountains several peaks rise in great purple heights, clothed throughout for ever in forests, with waterfalls drifting down, with clouds hanging above them: Pieter Both (2,690 ft.) the Ponce (2,651 feet) and Montagne du Rempart (2,532 feet). They are among the loveliest in the world, accessible, close to the sea.

The central plain stretches lazily towards the west and north of the Island but in the East it gradually rises up to the Grand Port mountains and in the south-west to the Black River Mountains. In this range is the highest point of the island "Piton de la Riviere Noire" (2,711 feet) but it is not a land-mark for it merges with adjacent high land. Unlike the Moka chain of mountains in the north West which cut through the rolling countryside, the ranges in the South and East cut off the plateau from the West with a series of ravines, cascades and mountain-torrents which heighten the scenic effect.

Nature, perhaps, has never been so bountiful to any people in the world as it has been to the Mauritians in bestowing upon them a land full to scenic beauty. The island is covered almost everywhere with

the most beautiful and rich coloured trees, bushes and shrubs. A sandy beach of dazzling whiteness is unique in its bush green fields and fertile land. You will still fail to believe whether one small portion of the world could be so crammed with wonders. There are the flowers. Wherever you go there are more flowers than you have ever seen in one spot before.

As far as the climate is concerned, Mauritius has no great extremes of heat or cold and there is ample rainfall for agriculture upon which the life of the island depends. The most pleasant part of the year is from September to November. Climate favoures gardening in this sub-tropical island. Most of the vegetables found in both European and Asian countries grow there while flowers seem to flourish in the rich earth of the central plateau.

Now let us come to those inhabiting that land of fairy dreams. During the span of time Mauritius was under the Dutch government, slaves or coolies were imported from different countries, namely India, Africa and Madagasear. Needless to say that merchants and globe-trotters from China and other countries immigrated to Mauritius. It happens that some Dutch, French and English have preferred Mauritius to their native land. Mauritius, therefore, is a multi-racial country, with a total population of about six to seven lakhs. All these people are the real glory of the island. They live together in reasonable harmony working out a manner of a well-rounded, successful and happy life. Mauritius inpresses people in the way that despite the differing cultures and traditions there is a mountain entity which allows the people to live in peace and friendship, to enjoy and share the fruits. Man is born to be free, free from want and fear and oppression, free to think, and to worship, free to live out his life in a dignified way with his family and his nation, publicly and in the secret places of his own heart. Life in Mauritius, therefore, is a life full of freedom. All Mauritians are in one family destined to live together.

The main towns of Mauritius are port-Louis, Makebourg, Curepipe and Rose-Hill. Port-Louis, the capital, at sea level on the north western coast is the centre of industry and trade. It was created by the French Governor, Make de Labourdonnais (1735-1746), the founder of the colony. He made Mauritius an important base on the sea route to India His statue dominates the